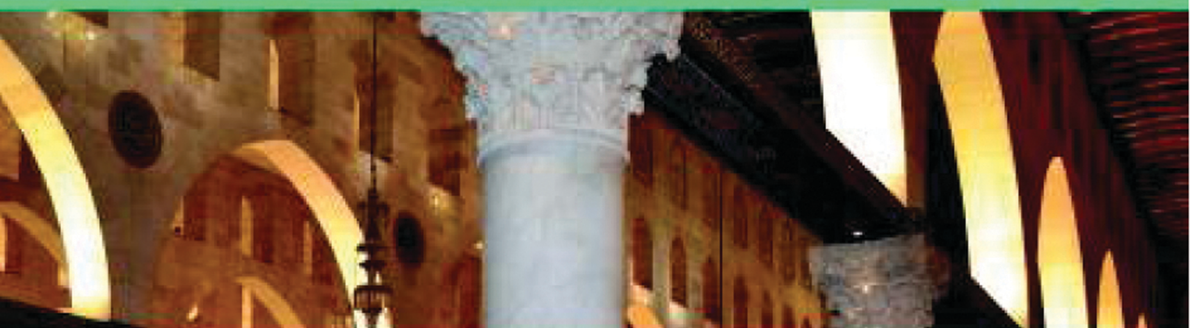
www.alrisala.org

الرسالہ

Al-Risala

March 2010 • No. 400



وقت کے استعمال کا بجٹ بنائیے، جس طرح
آپ اپنی آمدنی اور خرچ کا بجٹ بناتے ہیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الرسالہ

جاری کردہ 1976

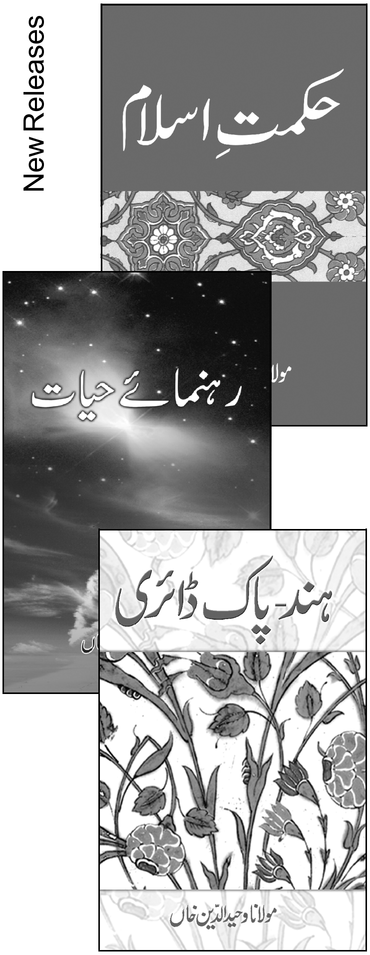
مارچ 2010

قطر کا سفرنامہ

اردو اور انگریزی میں شائع ہونے والا
اسلامی مرکز کا ترجمان

زیر سرپرستی
مولانا وحید الدّین خاں
صدر اسلامی مرکز

New Releases



Al-Risala Monthly
1, Nizamuddin West Market
New Delhi-110 013
Tel. 41827083, 46521511
24355454 Fax: 45651771
www.goodwordbooks.com
email: info@goodwordbooks.com

Subscription Rates
Single copy Rs. 10
One year Rs. 100
Two years Rs. 200
Three years Rs. 300

Abroad by Air Mail. One year $20

Printed and published by
Saniyasnain Khan on behalf of
Al-Markazul Islami, New Delhi.

Printed at Nice Printing Press,
7/10, Parwana Road,
Khureji Khas, Delhi-110 051

قطر کا سفرنامہ

قطر ایک خلیجی ملک ہے۔ قطر کی منسٹری آف فارین افئرس (Ministry of Foreign Affairs) کے تحت ایک ادارہ قائم ہے۔ اُس کا نام یہ ہے: مركز الدوحة الدُولي لحوار الأديان:

Doha International Center for Interfaith Dialogue

اِس ادارے کے تحت، دوحہ (قطر) میں ساتویں سالانہ انٹرنیشنل کانفرنس 21-20 اکتوبر 2009 کو ہوئی۔ اس کانفرنس کا متعین موضوع یہ تھا:

التضامن الإنساني (Human Solidarity)

اِس کانفرنس میں شرکت کے لیے دوحہ انٹرنیشنل سنٹر کے صدر الدکتور ابراہیم صالح النعیمی کے دستخط سے ایک دعوت نامہ مورخہ 14 جولائی 2009 ملا۔ اِس کے مطابق، دوحہ کا سفر ہوا۔ میرے ساتھ مددگار کے طور پر میرے دو اور ساتھی اِس سفر میں شریک تھے۔

باہر کے سفروں میں پہلا مرحلہ ویزا (visa) کا ہوتا ہے۔ عام طور پر ویزا آسانی سے مل جاتا ہے، لیکن اِس بار میرے ایک ساتھی کے ویزا کے حصول میں کافی مشکل پیش آئی، یہاں تک کہ آخری دن آ گیا۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ قطر کا سفر نہ ہوسکے گا۔ چناں چہ قطر میں مقیم ہمارے ایک ساتھی مولانا عبدالباسط عمری کو اطلاع دے دی گئی کہ اب میرا سفر نہ ہوسکے گا۔ وہ میرے سفر کے بہت زیادہ مشتاق تھے، اِس لیے وہ مایوس نہیں ہوئے، چناں چہ انھوں نے مسجد میں جا کر نماز پڑھی اور دعاء کی اور تھوڑی دیر کے اندر ای میل کے ذریعے ہمارے ساتھی کا ویزا دہلی میں موصول ہوگیا۔

یہ نماز کے ذریعے استعانت کا ایک انوکھا واقعہ تھا۔ اِس قسم کی نماز کو عام طور پر صلاۃ الحاجۃ کہا جاتا ہے۔ صلاۃ الحاجہ کا ایک انوکھا واقعہ ابھی حال میں میں نے پڑھا۔ یہ ہمالیہ ڈرگ کمپنی (بنگلور) کے فاؤنڈر حکیم محمد منال الدین (وفات: 1986) کا واقعہ ہے۔ اِس واقعے کو مختصراً ان کے صاحب زادہ محمد معراج الدین منال کے الفاظ میں یہاں نقل کیا جاتا ہے:

''ایک مرتبہ والد محترم پر سخت وقت آیا۔ آپ کے کام اور کمپنی کی تاریخ میں یہ نہایت پریشان کن مرحلہ تھا۔ یہ مشکل اتنی شدید نوعیت کی تھی کہ ہمالیہ کمپنی اپنی بقا کے لیے اندیشوں میں آ گئی تھی۔ دراصل گورنمنٹ کی طرف سے کمپنی کے خلاف ایک نوٹس آیا تھا، اس میں جو اعتراضات تھے، اس کے مطابق، کمپنی کے لیے بند ہوجانے کے علاوہ کوئی چارۂ کار نہ تھا۔ اِس موقع پر بمبئی میں ممتاز ماہرین قانون کو جمع کیا گیا تھا، مگر ان کے ساتھ طویل مشاورت بھی کسی حل کی طرف لے جانے میں ناکام ثابت ہوئی۔ مگر ٹھیک اُس وقت جب کہ امید کے تمام دروازے بند ہوگئے تھے، ابا جان نے ایک ایسا دروازہ پالیا جہاں صرف امید ہی امید تھی۔ آپ نے ہر بات کا انکار کیا اور نماز میں مشغول ہوگئے۔ آپ نماز سے فارغ ہوکر اُس آفس کو گئے جہاں سے نوٹس آیا تھا۔ آفس کے پاس زینے پر چڑھتے ہوئے ایک دوست سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے تعجب ظاہر کیا کہ منال صاحب آپ یہاں کیسے۔ ابا نے جواب میں وہ نوٹس دکھایا۔ اس دوست نے کہا یہ آفیسر میرا دوست ہے اور میرے بازو میں بیٹھتا ہے۔ میں آپ کے ساتھ چلتا ہوں، پھر انھوں نے آفیسر کو بتایا کہ یہ ایسے لوگوں میں سے نہیں ہیں۔ یہ اچھے آدمی ہیں، خواہ مخواہ کیوں ان کو پریشان کرتے ہو۔ اِس گفتگو اور متعلقہ تحقیق کے بعد اُس وقت آفیسر نے مذکورہ نوٹس کینسل کیا اور دوسرا نوٹس جاری کیا جو کمپنی کے مفاد میں تھا۔ اِس طرح کمپنی پرابلم سے نکل گئی اور الحمد للہ آج بھی کمپنی ترقی کر رہی ہے''۔ (ایک قابلِ تقلید اور مثالی شخصیت، صفحہ 21)

یہ طریقہ پیغمبر اسلام ﷺ کی سنت کے عین مطابق ہے۔ روایات میں آپ کے بارے میں آیا ہے کہ: **إذا حزبه أمر صلّى (أبو داؤد، كتاب الصلاة)** یعنی جب آپ کے ساتھ کوئی سخت معاملہ پیش آتا تو آپ نماز کے لیے کھڑے ہوجاتے۔ اِس قسم کی نماز کو عام طور پر صلاۃ الحاجۃ کہا جاتا ہے۔ اِس کی روح یہ ہے کہ آدمی مشکل وقت میں اللہ کو یاد کرے اور اُس سے اپنے لیے مدد مانگے۔

پروگرام کے مطابق، 19 اکتوبر 2009 کی صبح کو روانگی ہوئی۔ سفر کے آغاز میں میں نے یہ

دعاء کی کہ خدایا، میں تیرے راستے میں یہ سفر کررہا ہوں، تو اِس سفر میں سی 29 سے سی 29 تک (from C-29 to C-29) میرا ساتھی بن جا۔ یہ دعاء اللہ تعالی نے قبول فرمائی۔ میں نے بہت سے اسفار کئے ہیں، مگر اس سفر میں غالبًا پہلی بار ایسا ہوا کہ گھر سے ائر پورٹ تک مسلسل گاڑی چلتی رہی اور تقریباً 25 کلومیٹر کے اِس راستے میں کہیں رکنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔

روانگی سے پہلے دہلی میں حبیب بھائی (حیدرآباد) کا ٹیلی فون آیا۔ انھوں نے کہا کہ ایک چیز مجھے سخت پریشان کرتی ہے۔ جب میں کہیں گفتگو کرتا ہوں یا تقریر کرتا ہوں تو لوگ اکثر غیر متعلق (irrelevant) قسم کے سوالات کرنے لگتے ہیں۔ اِس قسم کا سوال سن کر مجھے اکثر غصہ آجاتا ہے۔ میں نے کہا کہ ایسے موقع پر غصے کی کوئی ضرورت نہیں۔ جب بھی آپ بولتے ہیں تو اُس وقت وہاں ہمیشہ ایسا ہوتا ہے کہ مخاطب اوّل (first audience) کے طور پر فرشتے موجود رہتے ہیں، اور مخاطب ثانی (second audience) کے طور پر انسان وہاں موجود ہوتے ہیں۔ آپ کسی انسان کے ناپسندیدہ ردّعمل پر دھیان مت دیجئے۔ آپ صرف یہ سوچیے کہ اِن حاضرین کی وجہ سے آپ کو یہ موقع ملا کہ آپ ایک ایسا ذکرِ اجتماعی کریں جو فرشتوں کے ریکارڈ میں درج ہوجائے۔

قرآن میں مومن کی ایک صفت سیاحت بتائی گئی ہے (التوبة: 112)۔ قرآن کے مطابق، مومن ایک سیّاح انسان ہوتا ہے۔ سیاحت یا سیاحی کے لفظی معنی سفر کے ہیں۔ مومن ایک بامقصد انسان ہوتا ہے، اِس لیے مومن کا سفر یقینی طور پر وہی ہے جو بامقصد سفر ہو۔ مومن کے مقصد کو قرآن میں دعوت الی اللہ کے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ اِس لحاظ سے، مومن کا سفر وہ ہے جو دعوتی سفر ہو، جس کے سفر میں دعوت ایک لازمی جز کی حیثیت سے شامل ہو۔

واشنگٹن (امریکا) کے ایک ادارہ (Pew Forum on Religion and Public Life) کے ایک حالیہ سروے میں بتایا گیا ہے کہ اِس وقت دنیا کی آبادی میں مسلمانوں کی تعداد ڈیڑھ بلین سے زیادہ (1.57 billion) ہے۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ — موجودہ انسانی آبادی میں ہر چار میں سے ایک شخص مسلمان ہے:

World over, 1 in 4 persons is a Muslim.

اِس کا مطلب یہ ہے کہ ہر مسلمان اگر یہ فیصلہ کرے کہ وہ کم ازکم چار غیر مسلموں تک خدا کی کتاب (قرآن) پہنچائے گا تو نہایت محدود مدت میں قرآن دنیا کے تمام مردوں اور عورتوں تک پہنچ جائے گا۔ جدید کمیونکیشن کے دور سے پہلے یہ ایک بے حد مشکل کام تھا، لیکن اب جدید کمیونکیشن کے ذرائع نے عالمی سفر کو ممکن بنا دیا ہے۔ عالمی سفر دراصل عالمی انٹریکشن کا دوسرا نام ہے۔ موجودہ زمانے میں یہ ممکن ہوگیا ہے کہ عالمی سفر کو عالمی دعوت کا ذریعہ بنا دیا جائے۔ مسلمانوں کے اندر اگر دعوت کا جذبہ موجود ہو تو یہ ہوگا کہ ہر مسلمان ون مین، ون مشن (one man, one mission) کا کیس بن جائے گا۔ وہ ایک طرف سفر کرے گا، اور دوسری طرف وہ عالمی سطح پر قرآن کو پھیلانے کا کام کرے گا۔ ''ادخالِ کلمہ'' کی جو پیشین گوئی حدیث میں آئی ہے، وہ آج پوری طرح قابل عمل بن چکی ہے۔

World over, 1 in 4 persons is a Muslim

Washington: The global Muslim population stands at 1.57 billion, meaning that nearly 1 in 4 people in the world practice Islam, according to a report on Wednesday billed as the most comprehensive of its kind.The Pew Forum on Religion and Public Life report provides a precise number for a population whose size has long been subject to guesswork, with estimates ranging anywhere from 1 billion to 1.8 billion.The project, three years in the making, also presents a portrait of the Muslim world that might surprise some. For instance, Russia has more Muslims than Jordan and Libya combined.“This whole idea that Muslims are Arabs and Arabs are Muslims is really just obliterated by this report,” said Amaney Jamal, a professor of politics at Princeton University.The report also sought to pinpoint the world's Sunni-Shia breakdown, but difficulties arose because so few countries track sectarian affiliation. As a result, the Shia numbers are not as precise; the report estimates that Shias represent between 10% and 13% of the Muslim population.The report provides further evidence that while the heart of Islam might beat in the Middle East, its greatest numbers lie in Asia: More than 60% of the world’s Muslims live in Asia. About 20% live in the Middle East and North Africa, 15% live in Sub-Saharan Africa, 2.4% are in Europe and 0.3% in the Americas. Three-quarters of Muslims living as minorities are concentrated in five countries: India (161 million), Ethiopia (28 million), China (22 million), Russia (16 million) and Tanzania (13 million).

India's immense size is underscored by the fact that it boasts the third-largest Muslim population of any nation - yet Muslims account for just 13% of the population. AP (*The Times of India,* New Delhi, October 9, p. 21)

ہم لوگ تین آدمی تھے۔ کانفرنس میں لوگوں کو دینے کے لیے ہم قرآن کا انگریزی ترجمہ اور دوسرے اسلامی لٹریچر اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ ائرپورٹ پر پہنچ کر ہمارے ساتھیوں نے اس کو چیک ان (check-in) کردیا۔ قطر کے اِس سفر میں غیر معمولی قسم کی سہولیات کا تجربہ ہوا۔ حقیقت یہ ہے کہ قطر کے اِس چار روزہ سفر میں ہم کو غیر متوقع طور پر اتنی زیادہ سہولتیں (facilities) حاصل رہیں کہ ان کو اگر شاہانہ سفر کہا جائے تو یہ مبالغہ نہ ہوگا۔

دہلی کے اندرا گاندھی انٹرنیشنل ائرپورٹ پر ہم لوگ داخل ہوئے تو فوراً ہی ائرلائن کی ایک خاتون نے آگے بڑھ کر ہمارا استقبال کیا اور ہم کو ضروری رہنمائی دی۔ یہ منظر دیکھ کر دل سے دعاء نکلی کہ خدایا، جب میں آخرت کے گیٹ پر پہنچوں تو وہاں بھی رحمت کا ایک فرشتہ اِس عاجز انسان کے استقبال کے لیے موجود ہو۔

ہم لوگ ائرپورٹ کے اندر داخل ہوئے تو حسبِ معمول یہاں بہت سے مسافر ہر طرف دکھائی دے رہے تھے، ہندستانی بھی اور غیر ہندستانی بھی۔ میں نے اُن کو دیکھا تو میں نے محسوس کیا جیسے کہ ہر ایک خاموش زبان میں یہ کہہ رہا ہے کہ — میرا واحد کنسرن اپنی دنیا کی زندگی کو بہتر بنانا ہے، میری زندگی کا فارمولا صرف یہ ہے:

Right here, Right now!

ائرپورٹ کی رسمی کارروائی کے بعد ہم لوگ وہاں کے لاؤنج (lounge) میں چلے گئے۔ اِس میں مسافروں کے لیے ہر قسم کا اعلیٰ انتظام موجود تھا۔ لاؤنج میں میری ملاقات ایک عرب سے ہوئی۔ وہ مسقط (عمان) سے تعلق رکھتے تھے۔ گفتگو کے دوران انھوں نے بتایا کہ وہ یہاں ''تبلیغ'' میں آئے تھے۔ وہ عربی زبان کے علاوہ کچھ انگریزی بھی جانتے تھے۔ اُن سے میں نے گفتگو کی کوشش کی، مگر معلوم ہوا کہ وہ سادہ قسم کے آدمی ہیں اور زیادہ علمی بات کے عادی نہیں، ہمارے ساتھیوں نے ان کو سی پی ایس کا دعوتی لٹریچر دیا۔ مجھے اِس قسم کے کئی تجربات پیش آئے ہیں۔ اِن تجربات کی بنا پر میرا

احساس یہ ہے کہ عرب کے جو لوگ یہاں تبلیغ میں آتے ہیں، وہ دراصل عرب کے ”میواتی“ ہوتے ہیں، نہ کہ وہاں کے اہلِ علم۔

حبیب بھائی (حیدرآباد) سے دوسری بار ٹیلی فون پر بات ہوئی۔ گفتگو کے دوران میں نے کہا کہ دین میں سب سے زیادہ اہمیت شکر کی ہے۔ ہماری زندگی میں بار بار ایسے واقعات پیش آتے ہیں جو شکر کے جذبے کو گھٹانے والے ہوتے ہیں۔ ایسے موقع پر مومن کو بہت زیادہ باشعور ہونا چاہئے۔ مومن کے لیے شکر کا ایروژن (erosion) نا قابلِ برداشت ہونا چاہئے۔

اصل یہ ہے کہ اگر کسی معاملے میں 99 فی صد شکر کی بات ہو اور صرف ایک فی صد منفی بات تو شیطان یہ کرتا ہے کہ وہ ایک فی صد منفی بات کو اتنا زیادہ بڑھاتا ہے کہ 99 فی صد مثبت بات آدمی کی نظر سے اوجھل ہو جاتی۔ وہ شکر کے سمندر میں رہتے ہوئے بھی ناشکری کے احساس میں جینے لگتا ہے۔ ایسے موقع پر آدمی کو چاہیے کہ وہ فوراً یہ کہے کہ: اللھم إنی أعوذ بك من همزات الشياطين۔ اِس کے بعد ان شاء اللہ، شیطان بھاگ جائے گا۔ یہ صرف عقیدہ کی بات نہیں، بلکہ یہی میرا تجربہ ہے۔

میں نے کہا کہ ناشکری کی کوئی بات دماغ میں آئے تو آدمی کو چاہئے کہ وہ اس کو سرتا سر بے اصل سمجھے۔ کسی بھی عذر کی بنا پر وہ اس کو اپنے دماغ میں جگہ نہ دے۔ وہ اس کو بداہۃً قابلِ رد (prima facie its stands rejected) سمجھتے ہوئے فی الفور اپنے دماغ سے نکال دے۔

دہلی ائرپورٹ پر میں نے قدم قدم پر خدا کی نصرت اور رحمت کے ایسے مناظر دیکھے کہ میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور میری زبان پر یہ الفاظ جاری ہوگئے — خدایا، اگر میں دنیا کی تمام زبانیں جانتا اور تمام زبانوں کی ڈکشنریوں کے تمام الفاظ مجھ کو یاد ہوتے اور میں تیری حمد اور تیرا شکر ادا کرتا تو میں اس کا حق ادا نہیں کرسکتا تھا۔ خدایا، اگر دنیا کے تمام درخت میرے لیے قلم بنا دئے جاتے اور تمام سمندر میرے لیے سیاہی ہوتے اور میں تیرے احسانات کو لکھنے بیٹھتا تو یقیناً ایسا ہوتا کہ تمام قلم ختم ہو جائے اور تمام سمندر خشک ہو جاتے، تب بھی تیری حمد کا بیان ختم نہ ہوتا۔

یہ الفاظ جب میری زبان پر آئے تو اُس وقت میں نے سوچا کہ قرآن (لقمان: 27) میں جو یہ

بات کہی گئی ہے، بظاہر وہ خدا کی طرف سے ہے، لیکن اپنی حقیقت کے اعتبار سے وہ انسانی جذبات کا اظہار ہے۔ وہ علمِ الٰہی کا بیان نہیں، بلکہ وہ بندۂ مومن کا احساس ہے۔ انسان سے یہ مطلوب ہے کہ وہ کائنات میں تدبر کرکے آلاءِ خداوندی کو اِس طرح دریافت کرے کہ واقعۃً اس کو یہ محسوس ہونے لگے کہ تمام درختوں کے قلم اور تمام سمندروں کی سیاہی بھی اس کے جذباتِ حمد کو بیان کرنے کے لیے ناکافی ہیں۔

سفر کے دوران میں نے بہت سے لوگوں کو دیکھا، بہت سے لوگوں سے ملاقاتیں ہوئیں۔ ان میں ہر مذہب کے لوگ شامل تھے۔ اِس تجربے سے میرے اندر ایک عجیب احساس پیدا ہوا، وہ یہ کہ تمام لوگ خدا کی پکڑ سے بالکل بےخوف ہوچکے ہیں۔ ہر مذہبی گروہ نے ایسے فلسفے گھڑ لیے ہیں جس میں سب کچھ ہے، لیکن خدا کی پکڑ (accountability) کا ذکر اس کے اندر موجود نہیں — پنرجنم کے فلسفے نے ہندوؤں کو بےخوف کردیا، کفّارے کے عقیدے نے عیسائیوں کو بےخوف کردیا، شفاعت کے عقیدے نے مسلمانوں کو بےخوف کردیا، منتخب گروہ (chosen people) کے عقیدے نے یہود کو بےخوف کردیا، شیطان کا سب سے بڑا حربہ اِسی قسم کے مغالطہ آمیز عقائد اور فلسفے ہیں۔

اپنے ایک ساتھی سے بات کرتے ہوئے میں نے کہا کہ غسل (bath) کو مسلمان عام طور پر صرف طہارت کا ایک حصہ سمجھتے ہیں، حالاں کہ غسل، نظافت (cleanness) کا ایک حصہ ہے۔

ایک بار میں اعلیٰ تعلیم یافتہ ہندوؤں کی ایک مجلس میں شریک تھا۔ گفتگو کے دوران ایک ہندو نے کہا کہ مسلمان تو صرف جمعہ جمعہ نہاتے ہیں۔ مسلمانوں کے یہاں صفائی کا کوئی تصور نہیں۔ میں نے کہا کہ یہ بات آج کل کے مسلمانوں کے بارے میں درست ہوسکتی ہے، مگر یہ بات دورِ اوّل کے مسلمانوں کے بارے میں درست نہیں۔ میں نے کہا، خلیفۂ سوم حضرت عثمان بن عفّان کے ایک خادم اُن کے بارے میں کہتے ہیں کہ: كان يغتسل كلّ يوم مرّة أو مرّتين (وہ ہر دن ایک بار یا دو بار غسل کرتے تھے)۔ اِس کو سن کر سارے ہندو بہت خوش ہوگئے۔ حاضرین میں سے ایک سوامی چیدانند (رشی کیش) نے کہا کہ ہم کو معلوم نہیں تھا کہ اسلام میں اتنی اچھی اچھی باتیں ہیں۔ آپ ہم کو اسلام اِن ڈیلی لائف (Islam in Daily Life) کے موضوع پر تین سو صفحات کی ایک کتاب تیار کرکے دیجیے۔

ہم اس کو دس زبانوں میں چھاپیں گے اور اس کو ساری دنیا میں پھیلائیں گے۔

19 اکتوبر 2009 کی صبح کو ہم لوگ قطر ائر لائنز کی فلائٹ (QR 233) میں داخل ہوئے۔ دہلی سے قطر کی دوری تقریباً 3 ہزار کلومیٹر ہے۔ یہ سفر تین گھنٹے میں طے ہوا۔ قطر ائر لائنز ایک ٹاپ کی ہوائی کمپنی سمجھی جاتی ہے۔ اس کے اندر جب میں بیٹھا ہوا تھا تو ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے کہ ایک فلائنگ پیلیس (flying palace) ہے اور میں اس کے اندر ایک تخت نما کرسی پر بیٹھا ہوا پرواز کر رہا ہوں۔ یہ منظر دیکھ کر میری زبان پر یہ دعا جاری ہوگئی — خدایا، دنیا میں تو نے مجھ کو سب کچھ دیا، آخرت میں بھی تو مجھ کو سب کچھ دے دے۔ کوئی شریف انسان دینے کے بعد نہیں چھینتا۔ تو تمام شریفوں سے زیادہ اعلیٰ اور عظیم ہے۔ تجھ سے میں یہی امید رکھتا ہوں کہ تو آخرت میں اِس عاجز بندے کے ساتھ اُس سے زیادہ بہتر معاملہ فرمائے گا جو دنیا میں تو نے اس کے ساتھ کیا ہے۔



جہاز کے اندر مختلف قسم کے میگزین اور اخبار مطالعے کے لیے موجود تھے۔ ان میں مختلف قسم کی تصویریں چھپی ہوئی تھیں۔ اِن تصویروں کو دیکھ کر میری زبان پر یہ الفاظ آئے — خدایا، تو نے کچھ لوگوں کو انسانِ قوی بنایا اور کچھ لوگوں کو انسان ضعیف۔ جو انسانِ قوی تھا، وہ ''ربّی أکرمن'' کی نفسیات میں مبتلا ہوگیا۔ جو انسانِ ضعیف تھا، وہ ''ربّی أھانن'' کی نفسیات میں جینے لگا۔ قوت اور ضعف دونوں امتحان کی حالتیں تھیں، لیکن قوی اور ضعیف دونوں قسم کے انسان اپنے امتحان میں فیل ہوگئے۔ دونوں کا یہ حال ہوا کہ وہ خدا کے تخلیقی پلان کو سمجھے بغیر زندگی گزارتے رہے، اور آخر کار وہ مر کر اِس دنیا سے چلے گئے۔

جہاز کے اندر نیویارک ٹائمس کے گلوبل ایڈیشن کا شمارہ 18-17 اکتوبر 2009 دیکھا۔ اِس شمارے میں ایک امریکی جنرلسٹ ڈیسٹر فلکنس (Dexter Filkins) کا لکھا ہوا انٹرویو چھپا تھا۔ یہ انٹرویو انھوں نے افغانستان میں مقیم امریکا کے فوجی افسر جنرل میک کرسٹل (Mc Chriystal) سے لیا تھا۔ اِس میں بتایا گیا تھا کہ اِس وقت افغانستان میں امریکا کے 65,000 فوجی موجود ہیں۔ مگر جنرل میک کرسٹل نے مزید 40,000 فوجیوں کا مطالبہ کیا ہے۔ انٹرویو میں امریکا کے مذکورہ فوجی افسر نے اپنی کسی کامیابی کا ذکر نہیں کیا تھا۔ البتہ آخر میں انھوں نے عراق کی حالیہ جنگ کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے کہا تھا کہ — عراق کا ایک سبق یہ ہے کہ ہمیں کسی بھی حال میں اپنا اعتماد نہیں کھونا چاہیے:

One of the big takeaways from Iraq was that, you have to not lose confidence in what you are doing. (p. 4)

دوسرے لفظوں میں یہ کہ ہمیں مایوسی میں بھی امید پر قائم رہنا چاہیے — عجیب بات ہے کہ اِس سے پہلے سوویت روس نے افغانستان میں فوجی اقدام کرکے اپنے سپر پاور ہونے کی حیثیت کو کھودیا تھا۔ اب امریکا اِسی علاقے میں فوجی اقدام کرکے دوبارہ اُسی انجام سے دوچار ہورہا ہے۔ شاید تاریخ کا سب سے زیادہ انوکھا سبق یہ ہے کہ کسی نے تاریخ سے سبق نہیں سیکھا۔

فلائٹ کے اندر دوحہ (قطر) سے نکلنے والا ایک اور اخبار (The Peninsula) کا شمارہ 19 اکتوبر 2009 موجود تھا۔ اس کی ایک خبر کا عنوان یہ تھا:

Vodafone Qatar Celebrates Diwali

خبر میں بتایا گیا تھا کہ کمپنی نے دوحہ کے ایک رزورٹ (Sealine Beach Resort) میں دیوالی کا تیوہار منایا۔ اِس رزورٹ کو انڈیا کے انداز میں سجایا گیا اور اس کا نام لٹل انڈیا (Little India) رکھ دیا گیا۔ کمپنی نے دو ہزار دیوالی گفٹ باکس، برلا پبلک اسکول کے بچوں کو دیا، اور چھ ہزار دیوالی گفٹ باکس وہاں کے سُوق ایریا میں کام کرنے والوں کے درمیان تقسیم کیا۔ اِس موقع پر کمپنی نے اعلان کیا کہ:

Vodafone aims to ‘make a world of difference for all people in Qatar’

قطر ایک مسلم ملک ہے، لیکن وہاں پچاس فی صد سے زیادہ غیر ملکی آباد ہیں۔ یہ لوگ قطر میں اپنے تیوہار مناتے رہتے ہیں۔ یہ جدید گلوبلائزیشن کا ایک ظاہرہ ہے۔ مسلم مبصرین عام طور پر اِس ظاہرے کو منفی معنوں میں لیتے ہیں، لیکن اِس ظاہرے کا ایک عظیم مثبت پہلو ہے، اور وہ دعوت کا پہلو ہے۔ موجودہ زمانے میں گلوبلائزیشن کی وجہ سے ایسا ہوا ہے کہ مدعو خود داعی کے پاس پہنچ گیا ہے۔ اِس لحاظ سے، گلوبلائزیشن بلاشبہہ ایک عظیم نعمت ہے۔

اپنے ایک ساتھی سے بات کرتے ہوئے میں نے کہا کہ زندگی کی کچھ غلطیاں ایسی ہوتی ہیں جن کو ساری عمر بھگتنا پڑتا ہے، کچھ ناخوش گوار چیزوں کو آخری حد تک برداشت کرنا ہوتا ہے۔ کیوں کہ قانونِ فطرت کے مطابق، اُن کا خاتمہ ممکن نہیں ہوتا۔ مثلاً ترکی کی عثمانی خلافت 1929 ختم ہوئی تو اس کو برداشت ہی کرنا تھا، تقسیم کے بعد 1947 میں پاکستان نے کشمیر کو کھودیا تو اس کو برداشت ہی کرنا تھا، 1948 میں فلسطین کی تقسیم ہوئی تو اس کو برداشت ہی کرنا تھا، 1992 میں بابری مسجد ڈھادی گئی تو اس کو برداشت ہی کرنا تھا، وغیرہ۔ مگر ہمارے رہنما اِن واقعات کو برداشت کے خانے میں نہ ڈال سکے۔ اِس کے نتیجہ میں مزید تباہی کے سوا اور کچھ نہیں ملا۔

تقریباً تین گھنٹے کی پرواز کے بعد ہمارا جہاز دوحہ (قطر) کے ائرپورٹ پر اترا۔ مجھے چوں کہ وھیل چیئر استعمال کرکے باہر جانا تھا، اِس لیے مجھ سے کہا گیا کہ آپ سیٹ پر بیٹھے رہیں۔ اِس کے بعد ہوائی جہاز کا ایک مخصوص دروازہ کھولا گیا۔ اس دروازے کے پاس وہ گاڑی لائی گئی جس کو ہائی لفٹ

(highlift) کہا جاتا ہے۔ ہائی لفٹ اوپر اٹھ کر ہوائی جہاز کے دروازے کے برابر آگئی۔ میں ہوائی جہاز سے نکل کر اس کے اندر داخل ہوگیا اور وھیل چیئر پر بیٹھ گیا۔ اس کے بعد ہائی لفٹ نیچے آئی اور وہاں سے روانہ ہوکر ائرپورٹ کے لاؤنج میں پہنچی۔ یہ منسٹری لاؤنج (ministry lounge) تھا۔ وہ اپنے آپ میں ایک چھوٹے محل کے مانند تھا۔ یہاں ہم لوگوں کو آرام دہ نشستوں پر بٹھا دیا گیا۔ ائرپورٹ کی بقیہ کارروائی اسٹاف کے لوگوں نے انجام دی۔ ائرپورٹ پر ہم لوگوں کو ریسیو کرنے کے لیے کانفرنس کے لوگوں کے علاوہ، مولانا عبدالباسط عمری اپنے ساتھیوں کے ہم راہ موجود تھے۔ ائرپورٹ سے بذریعہ کار روانہ ہوکر ہم لوگ ہوٹل شیریٹن (Sheraton) پہنچے۔ یہ غیر معمولی طور پر ایک بہت بڑا ہوٹل ہے۔ وہ یہاں کا ٹاپ کا ہوٹل سمجھا جاتا ہے۔

ہوٹل پہنچنے کے بعد پہلے مجھ کو رسپشن (reception) کے ایک حصے میں بٹھا دیا گیا۔ یہ ہوٹل شاہی محل کے انداز میں بنایا گیا ہے۔ وہاں بیٹھتے ہی خصوصی تواضع شروع ہوگئی۔ اس منظر کو دیکھ کر میری زبان پر یہ الفاظ جاری ہوگئے — خدایا، تجھ سے میں نے اپنے عجز کی تلافی کی دعاء کی تھی۔ تو نے اکرام کے درجے میں میرے ساتھ معاملہ فرمایا۔

رسپشن کی ضروری کارروائی کے بعد ہم لوگ ہوٹل کی پانچویں منزل پر واقع تین کمروں میں پہنچا دئے گئے۔ دو عام کمرے اور ایک سوئٹ (Suite 512)۔ میں نے سوئٹ میں داخل ہوتے ہی فوراً اے سی بند کروادیا۔ یہ ہوٹل بحر عرب کے کنارے بنایا گیا ہے اور سوئٹ بحرِ عرب کے بالکل کنارے واقع تھا۔ سوئٹ کی بالکنی میں بیٹھ کر دور تک سمندر کے مناظر دکھائی دیتے تھے۔

ہوٹل میں ایک صاحب سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے ٹنشن کی شکایت کی۔ میں نے کہا کہ ٹنشن ایک غیر فطری چیز ہے۔ ٹنشن فری لائف کا واحد فارمولا یہ ہے کہ آدمی ٹنشن کے ساتھ جینے کا آرٹ جان لے، وہ ناقابلِ اصلاح مسائل کے ساتھ موافقت کا راز سیکھ لے، وہ ٹنشن کو زندگی کے ایک مثبت حصے کے طور پر دریافت کرلے۔ ایسا کرنے کے بعد اُس کا ٹنشن ٹنشن نہ رہے گا، بلکہ وہ نارمل لائف کا ایک فطری حصہ بن جائے گا۔

ہوٹل میں کچھ اہلِ علم حضرات سے بات کرتے ہوئے میں نے کہا کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **خیر القرون قرنی، ثم الذین یلونهم، ثم الذین یلونهم (صحیح البخاری، کتاب المناقب، باب فضائل أصحاب النبی)** اِس حدیث کے مطابق، اسلام کی تاریخ میں تین اَدوار مستند ادوار کی حیثیت رکھتے ہیں — دورِ رسالت، دورِ صحابہ، دورِ تابعین۔ اِن تین ادوار (periods) کو ''قرون مشہود لہا بالخیر'' کہا جاتا ہے، یعنی وہ دور جن کے برسرِ خیر ہونے کی گواہی دی گئی ہے۔

اِس معیار کو سامنے رکھ کر دیکھا جائے تو وہ تمام شخصیتیں جن کو بعد کے مسلمانوں نے اکابر کا درجہ دے دیا، وہ سب کے سب غیر اکابر تھے۔ کیوں کہ وہ قرونِ مشہود لہا بالخیر کے بعد آنے والے زمانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ اِس معیار کے مطابق، صرف رسول، اصحابِ رسول اور تابعین، امت میں اکابر کا درجہ رکھتے ہیں۔ بعد کے تمام لوگ، امام ابوحنیفہ کے قول کے مطابق، **ھم رجالٌ و نحن رجال** کا مصداق ہیں۔ اِس اعتبار سے دیکھئے تو ''اکابر'' کا تصور امت میں ایک تباہ کن بدعت نظر آئے گا۔ کیوں کہ اِس تصور کے مطابق، یہ ہوتا ہے کہ غیر معیاری انسان معیار کا درجہ حاصل کر لیتے ہیں، قابلِ تنقید انسان، تنقید سے بالاتر قرار پا جاتے ہیں۔

کوئی شخص اگر یہ کہے کہ ختم نبوت کے بعد بھی کوئی نبی آسکتا ہے تو تمام علماء اس کی تکفیر و تضلیل میں سرگرم ہو جاتے ہیں، مگر جن لوگوں نے حدیث میں مذکورہ تین مستند ادوار کے بعد ایک نئے مستند دور (دور اکابر) کا اضافہ کیا، اُن کے خلاف بولنے والا کوئی نہیں۔

20 اکتوبر 2009 کی شام کو عشاء کے بعد قطر میں مقیم علماء تقریباً ایک درجن کی تعداد میں میرے کمرے میں اکٹھا ہوئے۔ یہ سب عمری علماء تھے، یعنی جامعہ دار السلام، عمرآباد (تمل ناڈو) کے فارغین۔ قطر میں تقریباً ڈیڑھ سو کی تعداد میں عمری علماء موجود ہیں۔ یہاں ان لوگوں کی ایک باقاعدہ تنظیم قائم ہے۔ ہر عمری عالم ہر ماہ اپنی آمدنی کا ایک حصہ اپنی تنظیم کو دیتا ہے۔ یہ رقم دینی اور دعوتی ضرورت کے لیے خرچ کی جاتی ہے۔ یہاں اِن عمری حضرات کا ماہانہ اجتماع ہوتا ہے۔ اِس طرح وہ لوگ آپس میں جڑے رہتے ہیں۔ ہر ایک پابندی کے ساتھ اور رضا کارانہ طور پر اپنی ذمے داری کو ادا

کرتا ہے۔ ان کے درمیان مکمل اتحاد ہے۔ مختلف مدارس کے فارغین بڑی تعداد میں مختلف ملکوں میں رہتے ہیں، لیکن میرے علم کے مطابق، کہیں بھی ان کے درمیان اِس قسم کا اتحاد موجود نہیں۔

ان حضرات سے دیر تک مختلف موضوعات پر باتیں ہوئیں۔ ایک سوال کے جواب میں میں نے کہا کہ میرا اصل موضوع تحدیاتِ عصریہ ہے، یعنی جدید فکری چیلنج کے مقابلے میں اسلام کے نقطۂ نظر کی جدید علمی سطح پر وضاحت۔ اِسی بنا پر مصر کے ایک عالم نے میری کتاب ''الإسلام یتحدّی'' کا سب ٹائٹل (sub title) اِن الفاظ میں مقرر کیا تھا: **مدخل علمي إلى الإيمان۔**

گفتگو کے دوران ایک عمری عالم نے کہا کہ آپ صبر اور ایڈجسٹمنٹ کی بات بہت زیادہ کرتے ہیں، آخر کب تک ایسا کیا جائے۔ میں نے کہا کہ صبر اور ایڈجسٹ مینٹ (adjustment) کی اہمیت تو آپ خود اپنے تجربے سے سمجھ سکتے ہیں۔ آپ یہاں ایک خلیجی ملک میں ہیں۔ یہاں یقینی طور پر آپ کے لیے ایسے مسائل ہوں گے جن کو آپ پسند نہ کرتے ہوں، لیکن آپ ان کے ساتھ ایڈجسٹ کرکے یہاں رہ رہے ہیں۔ اِس لیے کہ آپ جانتے ہیں کہ ایڈجسٹ کرنے میں آپ کو فائدہ ہے۔ اپنے اِسی تجربے کی بنا پر آپ میرے نقطۂ نظر کی اہمیت سمجھ سکتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ایڈجسٹ مینٹ ایک عمومی فطری اصول ہے۔ یہ اصول جس طرح آپ کے لیے مفید ہے، اُسی طرح وہ دوسرے تمام لوگوں کے لیے مفید ہے۔

میں نے کہا کہ عرب ملکوں میں باہر کے جو مسلمان رہتے ہیں، وہ عملاً یہاں سکنڈ کلاس کے شہری (second class citizen) بن کر رہتے ہیں، جب کہ یہی مسلمان ہندستان میں یہ شکایت کرتے ہیں کہ ہم کو سکنڈ کلاس شہری بنا کر رکھ دیا گیا ہے۔ حالاں کہ میرے تجربے کے مطابق، یہ بات عرب ملکوں کے بارے میں تو ضرور صحیح ہے، مگر وہ ہندستان کے بارے میں یقینی طور پر درست نہیں۔ مثال کے طور پر میں ہندستان میں مہاتما گاندھی اور یہاں کے دوسرے ہندو لیڈروں پر تنقید کرتا ہوں۔ میری یہ تنقید یہاں کے ہندی اور انگریزی اخباروں میں چھپتی ہے، لیکن اِس بنا پر یہاں میرے لیے کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہوا، جب کہ اگر کوئی شخص عرب ملکوں میں وہاں کے سربراہِ سلطنت پر تنقید کرے تو وہاں اس کا

رہنا ہی سرے سے ناممکن ہو جائے گا۔ اِس سلسلے میں ایک واقعہ یہاں قابلِ ذکر ہے۔ یہ واقعہ میں نے اپنی ڈائری میں 25 جولائی 2009 کو اِن الفاظ میں نقل کیا تھا:

''میرے ایک ساتھی مولانا ابو صالح انیس لقمان ندوی ابوظبی (امارات) میں رہتے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ ابوظبی میں کئی ہزار پاکستانی مسلمان غیر قانونی طور پر مقیم تھے۔ حکومت نے اُن کو ملک چھوڑنے کا حکم دے دیا۔ انیس لقمان صاحب نے اِس سلسلے میں حکومت سے استرحام (plea for mercy) کی بنیاد پر حکم کو واپس لینے کی کوشش کی۔ آخر کار، حکومت نے اپنے حکم کو واپس لے لیا۔ ابوظبی میں پاکستان کے سفیر اِس واقعے پر بہت خوش ہوئے۔ انھوں نے انیس لقمان صاحب سے کہا کہ آپ کو ہم اعزازی طور پر پاکستان کی شہریت (citizenship) دینا چاہتے ہیں۔ انیس لقمان صاحب نے کہا کہ میں اس کو دو شرطوں پر قبول کر سکتا ہوں— ہم انڈیا کے فادر آف دی نیشن مہاتما گاندھی پر تنقید کرتے ہیں اور وہاں ہماری کوئی پکڑ نہیں ہوتی۔ کیا آپ اِس کی اجازت دیں گے کہ میں پاکستان میں وہاں کے فادر آف دی نیشن مسٹر محمد علی جناح پر تنقید کروں اور میری کوئی پکڑ نہ ہو۔ پاکستانی سفیر نے کہا کہ نہیں۔ انیس لقمان صاحب نے دوسری بات یہ کہی کہ انڈیا میں ایک مسلمان ''مسلم انڈیا'' کے نام سے میگزین نکالتا ہے۔ کیا آپ پاکستان میں ہندو کو اجازت دیں گے وہ پاکستان میں ''ہندو پاکستان'' کے نام سے میگزین نکالے۔ پاکستانی سفیر نے کہا کہ نہیں۔ انیس لقمان صاحب نے کہا کہ پھر مجھے ایسے ملک کی شہریت بھی قبول نہیں''۔

ایک عمری عالم نے سوال کیا کہ آپ کا ایک دینی اور دعوتی مشن ہے، پھر آپ سیاسی موضوعات پر کیوں بولتے ہیں۔ میں نے کہا کہ میرا اصل موضوع تحدیاتِ عصر یہ ہے، یعنی جدید ذہن کے مطابق، علمی سطح پر اسلام کی تبیین۔ میری تمام تحریریں براہِ راست یا بالواسطہ طور پر اِسی موضوع سے تعلق رکھتی ہیں۔ میں نے کہا کہ اِسی قسم کا اعتراض اِس سے پہلے سر سید پر کیا گیا تھا۔ اُس وقت اِس کا جواب دیتے ہوئے مولانا شبلی نعمانی نے لکھا تھا کہ جو لوگ سر سید کی بعض باتوں پر اعتراض کرتے ہیں، انھوں نے

سرسید کے شاہ نامہ میں سے صرف ''مُنیژہ مَنم'' کو یاد کر رکھا ہے۔

آج عرب ملکوں کے شہر مادی ترقی کے اعتبار سے یورپ کا نمونہ معلوم ہوتے ہیں، لیکن اب سے صرف چالیس سال پہلے ایسا نہ تھا۔ اُس وقت عرب کے لوگ معاشی اعتبار سے نہایت پس ماندہ سمجھے جاتے تھے۔ اُس وقت برصغیر ہند کے دولت مند لوگ عربوں کو مالی مدد بھیجا کرتے تھے۔ حیدرآباد دکن میں مدینہ کے نام پر ایک وقف قائم کیا گیا تھا جس کے وقف نامے میں لکھا ہوا تھا کہ اس کی آمدنی مدینہ کے غرباء کے لیے بھیجی جائے گی۔

مولانا شبلی نعمانی (وفات: 1914) نے 1892ء میں مصر کا سفر کیا تھا۔ انھوں نے لکھا ہے کہ اسکندریہ میں سڑک کے کنارے عرب لوگ معمولی سامان بیچتے تھے اور اپنے سامان کو بیچنے کے لیے کہتے تھے: برأس سیدنا الحسین۔

اِس سلسلے میں مجھے خود اپنا ایک واقعہ یاد آتا ہے۔ میری نوجوانی کے زمانے میں عرب کے فقراء ''مسافر'' کے نام پر ہندستان آیا کرتے تھے، تاکہ وہ یہاں سے اپنے لیے کچھ تعاون حاصل کرسکیں۔ اِسی قسم کے ایک عرب مسافر ایک بار اعظم گڑھ یوپی میں میرے گاؤں آئے تھے۔ یہ غالباً 1940 کا واقعہ ہے۔ میں نے اُن کو اپنے گھر ٹھہرایا۔ شام کا کھانا کھانے کے بعد وہ میرے گھر کے مردانہ حصے میں سوگئے۔ اگلے دن صبح کو جب میں اُن سے ملا تو اُنھوں نے کہا کہ: ماکان النوم معنا باللیل (رات کو میں سونہ سکا)۔ اُن کا مطلب یہ تھا کہ مچھروں کی وجہ سے مجھ کو نیند نہیں آئی۔ صبح کے ناشتے کے بعد وہ پھر کہیں دوسری جگہ چلے گئے۔

اِسی طرح کے ایک عرب مسافر کا واقعہ میرے چچا زاد بھائی مولانا اقبال احمد خاں سہیل (وفات: 1955) نے بتایا تھا۔ جس زمانے میں وہ علی گڑھ میں زیرتعلیم تھے، وہاں ایک عرب مسافر آیا۔ اُن لوگوں نے عرب مسافر کو کچھ کھانے کی چیز پیش کی۔ اِس کے بعد مذکورہ عرب مسافر نے کچھ کہا جو اِنھیں اِس طرح سنائی دیا: جِبْ شیطان۔ سہیل صاحب کو اور ان کے ساتھیوں کو اِس کا مطلب سمجھ میں نہ آیا۔ بار بار پوچھنے پر معلوم ہوا کہ عرب مسافر یہ کہہ رہا تھا: جئی بشیٔ ثان، یعنی کوئی دوسری چیز

کھانے کے لیے لے آؤ۔

قطر کے بارے میں مجھے بتایا گیا کہ قطر کے حاکم (امیر دولتِ قطر) چالیس سال پہلے خچر پر سواری کرتے تھے۔ یہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ مگر یہاں زمین کے نیچے گیس کے ذخیرے دریافت ہو گئے۔ اِس گیس کے ذریعے تقریباً ایک درجن مختلف چیزیں بنتی ہیں۔ قطر گیس کے معاملے میں دنیا میں دوسرے نمبر پر ہے۔ گیس کی دریافت کے بعد صرف چند سالوں کے اندر قطر مغرب جیسا ترقی یافتہ ملک بن گیا۔ دوحہ یہاں کا دار السلطنت ہے۔ دوحہ شہر کو دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ یورپ کے کسی انتہائی ترقی یافتہ علاقے میں پہنچ گئے ہیں۔

ایک عالم سے ملاقات ہوئی۔ گفتگو کے دوران انھوں نے کہا کہ اسلام کے موضوع پر جو قدیم عربی کتابیں ہیں، صرف اُنھیں کو پڑھنا چاہیے۔ موجودہ زمانے میں اسلام کے بارے میں جو کتابیں لکھی گئی ہیں، ان کو پڑھنا غیر ضروری ہے۔ انھوں نے اپنے بارے میں کہا کہ میں صرف قدیم عربی کتابیں پڑھتا ہوں۔ آج کل اسلام کے بارے میں جو کتابیں لکھی گئی ہیں، میں اُن کو پڑھتا ہی نہیں۔ انھوں نے یہ بھی بتایا کہ وہ غیر مسلموں میں دعوت کا کام کرتے ہیں۔

میں نے کہا کہ اسلام اگر صرف تاریخ کا موضوع ہو تو آپ کی یہ روش درست قرار پائے گی۔ لیکن اسلام صرف تاریخ کا موضوع نہیں ہے۔ اسلام کی یہ منشا ہے کہ ہر دور کے لوگ اسلام کو ایک ابدی سچائی کے طور پر دریافت کریں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ موجودہ زمانہ ایک بدلا ہوا زمانہ ہے۔ قدیم دور اگر روایتی دور تھا تو موجودہ دور سائنٹفک دور ہے۔ موجودہ دور کے ذہن کو اگر آپ اسلام کی صداقت پر مطمئن کرنا چاہتے ہیں تو آپ کو جدید اسلوب (modern idiom) میں بولنا پڑے گا۔ ایسی حالت میں آپ پر لازم ہے کہ آپ جدید افکار (modern thought) سے واقفیت حاصل کریں، تاکہ آپ جدید انسان کو اس کی قابلِ فہم زبان میں ایڈریس کر سکیں۔

میں نے کہا کہ ایک کام ہے مسلمانوں کو نماز، روزہ کے مسائل بتانا۔ دوسرا کام ہے جدید ذہن کو اسلام کی صداقت پر مطمئن کرنا۔ مسلمانوں کو نماز، روزہ کے مسائل بتانے کے لیے قدیم کتابوں کا

مطالعہ کافی ہوسکتا ہے، لیکن اسلام کی دعوت کو موثر اسلوب میں پیش کرنے کے لیے جدید افکار سے واقفیت لازمی طور پر ضروری ہے۔

ایک صاحب جو قطر کی ایک مسجد میں امام ہیں اور اپنی فیملی کے ساتھ یہاں رہتے ہیں، انھوں نے کھانے کے لیے اپنے گھر آنے کی دعوت دی۔ میں نے کہا کہ میں صرف اِس شرط پر آؤں گا کہ آپ بالکل سادہ کھانے کھلائیں۔ پھر میں نے کہا کہ سادہ کھانے کی تعریف یہ ہے کہ آپ روزانہ جو کھانا کھاتے ہیں، وہی کھانا ہم کو کھلائیں۔ اس میں کسی اور آئٹم کا اضافہ نہ کریں۔

انھوں نے کہا کہ مگر حدیث میں آیا ہے کہ: **مَن کان یؤمن باللہ والیوم الآخر فلیکرم ضیفہ**۔ اِس حدیث کے مطابق، مہمان کا اکرام کرنا بھی مومن کی ایک صفت ہے۔ میں نے کہا کہ اکرامِ ضیف دل سے ہوتا ہے، نہ کہ پُرتکلف کھانا کھلانے سے، جس کا آج کل عام رواج ہے۔ اکرامِ ضیف کا مطلب یہ ہے کہ آپ اپنے مہمان سے محبت کے ساتھ ملیں، اس کی سچی محبت کریں، اس کے ساتھ خیر خواہی کا معاملہ کریں۔ ضیف کا اکرام دل سے ہوتا ہے، نہ کہ انواع واقسام کا کھانا کھلانے سے۔

آج کل مسلمانوں میں ایک بات بہت زیادہ کہی جاتی ہے، وہ یہ ہے کہ — اسلاف کی پیروی کرو۔ یہ بات بظاہر درست معلوم ہوتی ہے، لیکن عملی اعتبار سے دیکھئے تو اِس میں پوری امت کے لیے کوئی واضح رہنمائی پائی نہیں جاتی۔ پیروی کا لفظ ایک واحد نقطۂ اتحاد (point of unity) چاہتا ہے، لیکن ''اسلاف کی پیروی'' کے لفظ میں کوئی واحد نقطۂ اتحاد موجود نہیں۔

حدیث کی ایک پیشین گوئی موجودہ زمانے میں واقعہ بن چکی ہے، وہ یہ کہ امت مختلف گروہوں میں بٹ گئی ہے۔ مثلاً سلفی گروہ، حنفی گروہ، بریلوی گروہ، شیعہ گروہ، اسی طرح ندوی گروہ، دیوبندی گروہ، وغیرہ۔ اِن میں سے ہر گروہ کے اپنے اپنے اکابر ہیں۔ ہر ایک کے اکابر اس کے لیے اپنے اسلاف کا درجہ رکھتے ہیں۔ مثلاً اہلِ حدیث کے اکابر امام ابن تیمیہ اور امام ابن قیم ہیں، احناف کے اکابر امام ابوحنیفہ اور امام ابو یوسف ہیں۔ اِسی طرح دیوبندیوں کے اکابر مولانا محمد قاسم نانوتوی اور مولانا حسین احمد مدنی ہیں، اور ندویوں کے اکابر مولانا سید سلیمان ندوی اور مولانا سید ابوالحسن علی ندی ہیں، وغیرہ۔

ایسی حالت میں اگر یہ کہا جائے کہ ’’اسلاف کی پیروی کرو‘‘ تو اِس اصول کو جاننے کے باوجود اس کا مفہوم ایک نہیں ہوگا، بلکہ کئی ہو جائے گا، ہر ایک اپنے اکابر سلف کو الگ الگ اپنا مقتدا سمجھے گا۔ اِس طرح امت بدستور مختلف گروہوں میں بٹی رہے گی، جیسا کہ وہ اِس وقت بٹی ہوئی ہے۔

اِس کے بجائے اگر لوگوں کو یہ بتایا جائے کہ رسول اور اصحابِ رسول کی پیروی کرو تو لوگوں کو واحد نقطۂ پیروی مل جائے گا، کیوں کہ اِس معاملے میں امت کے مختلف گروہوں کے درمیان کوئی اختلاف نہیں۔ ایک ہی رسول ہر ایک کے لیے رسول ہے اور ایک ہی جماعتِ صحابہ ہر ایک کے لیے جماعتِ صحابہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ ایسا کہنے کی صورت میں ہر ایک کو مشترک طور پر ایک ہی نقطۂ پیروی مل جائے گا، اور وہ ہے رسول اور اصحابِ رسول کی پیروی۔ یہی طریقہ قرآن اور سنت کے مطابق ہے، اور اِس طریقے کے ذریعے امت کے اندر صحیح ذہن اور اتحاد پیدا ہوسکتا ہے۔

ایک صاحب نے حجر اسود کے بارے میں سوال کیا۔ اُن کا سوال ان کے الفاظ میں یہ تھا:

In the last lecture (18 Oct. 2009) you said that Black Stone (Hajar al Aswad) is just a stone and Prophet Ibrahim took from one of the mountains, that it is just a starting point for Tawaf. Why did Prophet Muhammad kiss it and all Muslims want to kiss it, if this is just a stone taken from a mountain?

میں نے اِس سوال کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ حجرِ اسود کوئی پُر اسرار پتھر نہیں۔ ایسی کوئی حدیث موجود نہیں جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لفظاً یہ کہا ہو کہ تم لوگ حجر اسود کو بوسہ دو۔ حجر اسود کی حیثیت صرف طواف کے لیے ایک نقطۂ آغاز (starting point) کی ہے۔ ایک حاجی اگر حجر اسود کی طرف ہاتھ سے اشارہ کرکے اپنا طواف شروع کرے تو یہ بھی عین درست ہوگا، اِس سے اُس کے حج میں کوئی کمی واقع نہ ہوگی۔ خلیفۂ ثانی حضرت عمر فاروق کے بارے میں روایات میں آیا ہے کہ:

أنه جاء إلى الحجر الأسود فقبّله فقال: إنّى أعلم أنّك حجرٌ، لا تضر ولا تنفع، ولو لا أنّى رأيتُ النّبىَّ صلى الله عليه وسلم يُقبّلُك، ما قبّلتك (صحيح البخارى، كتاب الحج، باب ما ذُكر فى الحجر الأسود) یعنی عمر فاروق طوافِ کعبہ کے وقت حجر اسود کے پاس

آئے۔ انھوں نے اس کو بوسہ دیا، پھر انھوں نے کہا کہ میں جانتا ہوں کہ تو صرف ایک پتھر ہے، تو نہ نقصان پہنچا سکتا ہے اور نہ فائدہ پہنچا سکتا ہے۔ اگر میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بوسہ دیتے ہوئے نہ دیکھا ہوتا تو میں تجھ کو ہرگز بوسہ نہ دیتا۔

حضرت عمر فاروق کے اِس قول سے ثابت ہوتا ہے کہ حجر اسود کوئی پراسرار پتھر نہیں۔ اس کے ساتھ یہ عقیدہ وابستہ نہیں کہ وہ کوئی نقصان یا فائدہ پہنچانے کی طاقت رکھتا ہے، جیسا کہ بتوں کے متعلق سمجھا جاتا ہے۔ وہ صرف آغازِ طواف کا ایک نشان ہے، اِس سے زیادہ اور کچھ نہیں۔

اب یہ سوال ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حجر اسود کا بوسہ کیوں دیا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ حجر اسود پیغمبر ابراہیم کی ایک یادگار (momento) ہے، وہ ایک عظیم پیغمبرانہ تاریخ کی یاد دلاتا ہے۔ حجر اسود کو بوسہ دینا دراصل پیغمبر ابراہیم کے لیے اپنے جذباتِ محبت کا اظہار ہے، نہ کہ کسی بت کے لیے جذباتِ پرستش کا اظہار۔ یہ انسانی فطرت ہے کہ کسی بچھڑے ہوئے محبوب کی کوئی چیز ملے تو آدمی اس کو لے کر مختلف طریقے سے اپنے جذبات کا اظہار کرتا ہے، وہ کبھی اس کو چومتا ہے، کبھی اس کو اپنے سر پر رکھتا ہے، کبھی اس کو اپنے سینے سے لگاتا ہے، حجر اسود کو بوسہ دینا اِسی طرح حضرت ابراہیم کے لیے اپنے جذباتِ محبت کا اظہار ہے، اِس سے زیادہ اور کچھ نہیں۔

قطر کے زمانۂ قیام میں مجھے ہر قسم کی سہولیات (facilities) اعلیٰ معیار پر حاصل تھیں، مگر ایک لمحہ کے لیے وہاں مجھے سکون حاصل نہ تھا۔ اس کا ایک سبب یہ تھا کہ میرے جیسے انسان کو سکون صرف مادّی سامان سے حاصل نہیں ہوسکتا، میرے جیسے انسان کو سکون فکری خوراک سے ہوتا ہے اور وہ یہاں مجھے حاصل نہ تھی۔ عربوں کا معاملہ یہ ہے کہ اُن سے صرف رسمی انداز کی بات ہوسکتی تھی۔ عربوں کے ساتھ اعلیٰ نوعیت کا فکری تبادلۂ خیال ممکن نہیں تھا، اور دوسرے ملکوں کے جو لوگ قطر میں آباد ہیں، اُن کا واحد کنسرن پیسہ کمانا ہے۔ عرب دنیا کا سب سے بڑا خلا یہ ہے کہ یہاں فکری آزادی نہیں پائی جاتی۔ فکری آزادی ہی سے علمی ترقی ہوتی ہے۔ جہاں لوگوں کو فکری آزادی حاصل نہ ہو، وہاں کبھی علمی ارتقاء کا ماحول نہیں بن سکتا۔

قطر میں جو ہندستانی ہیں، ان میں زیادہ تر کیرلا کے لوگ ہیں۔ ان میں مسلم بھی ہیں اور غیر مسلم بھی۔ یہ اتفاقی بات نہیں ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ کیرلا کے لوگ، بلکہ ساؤتھ انڈیا کے لوگ، ہر جگہ آسانی سے قابلِ قبول بن جاتے ہیں۔ اِس کا سبب یہ ہے کہ ان کے اندر پروفیشنل ازم (professionalism) ہوتا ہے۔ پروفیشنل ازم کا مطلب سادہ لفظوں میں یہ ہے کہ — اپنے کام سے کام رکھنا۔ شمالی ہند کے لوگوں کا مزاج سیاسی ہوتا ہے۔ وہ بہت جلد اپنی سیاست شروع کر دیتے ہیں۔ اِس کے برعکس، جنوبی ہند کے لوگوں کا مزاج ''اپنے کام سے کام'' والا ہوتا ہے۔ ان کی اِس صفت نے اُن کو ہر جگہ مقبول بنا دیا ہے۔

ایک صاحب سے بات کرتے ہوئے میں نے کہا کہ آپ لوگ اسرائیل کے بارے میں صرف یہ جانتے ہیں کہ وہ فلسطینیوں پر تشدد کرتا ہے۔ اسرائیل کے بارے میں اس کے سوا کوئی اور بات آپ نہیں جانتے۔ میں نے کہا کہ آپ لوگوں کو اس معاملے میں عدل سے کام لینا چاہیے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسرائیل یک طرفہ طور پر تشدد نہیں کرتا۔ فلسطینی اُن کو پتھر مارتے ہیں تو اسرائیل اِس کے جواب میں اُن کو بم مارتا ہے۔ یہ دوطرفہ معاملہ ہے، نہ کہ یک طرفہ معاملہ۔ مگر عربوں کو یا مسلمانوں کو اسرائیل میں پیش آنے والے اِس واقعے کی کوئی خبر نہیں۔ اِس کا سبب یہ ہے کہ مسلم میڈیا میں اِس کا کوئی چرچا نہیں ہوتا۔

ایک صاحب سے گفتگو کرتے ہوئے میں نے کہا کہ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ اسلاف کا لٹریچر ہمارے لیے کافی ہے، ہم کو مزید لٹریچر کی ضرورت نہیں۔ میں نے کہا کہ یہ صرف ایک غیر عملی بات ہے۔ خود ایسا کہنے والے بھی اس پر عمل نہیں کر سکتے۔

میں نے کہا کہ اسلاف کی کتابوں کے دو حصے ہیں — ایک، وہ جو نماز روزہ جیسی عبادات سے متعلق ہیں۔ دوسرے، وہ جو ملی پالیسی سے تعلق رکھتے ہیں۔ نماز روزہ جیسی عبادات کے معاملے میں آپ اسلاف کی پیروی کر سکتے ہیں، کیوں کہ یہ مسائل اپنی نوعیت کے اعتبار سے ابدی ہیں۔ لیکن جہاں تک اُن باتوں کا تعلق ہے جن کو ملی پالیسی کہا جاتا ہے، ان کا معاملہ بالکل مختلف ہے۔ ان میں حالاتِ زمانہ کی رعایت بہت ضروری ہوتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ملی پالیسی والا شعبہ اُس مشہور فقہی

اصول کے تحت آتا ہے جس کو اِن الفاظ کے تحت بیان کیا جاتا ہے: **تتغیّر الأحکام بتغیّر الزمان والمکان**۔ اگر آپ ایسا نہ کریں تو آپ کے ملی معاملات بگڑ کر رہ جائیں گے۔

خود ہمارے اسلاف نے یہ فقہی اصول مقرر کیا ہے کہ: **تتغیر الأحکام بتغیر الزمان والمکان**۔ اب سوال یہ ہے کہ اسلاف کا مقرر کیے ہوئے اِس اصول کا انطباق کیا ہے، عملی طور پر اس کو کن حالات میں منطبق کیا جائے گا۔ جب بھی زمان ومکان بدلیں گے اور مذکورہ اصول کے مطابق، احکام میں تغیر کیا جائے گا تو یہ تغیر یقینی طور پر اسلاف کا اعادہ نہیں ہوگا، بلکہ وہ اسلاف کی کہی ہوئی باتوں کے علاوہ کوئی بات ہوگی۔

20 اکتوبر 2009 کو میری تقریر تھی۔ تقریر کا موضوع ''امن اور اسلام'' تھا۔ میری تقریر انگریزی زبان میں تھی۔ میں نے اپنی تقریر میں جو باتیں کہیں، اُن میں سے ایک بات یہ تھی کہ اِس معاملے میں مسلمانوں کا ذہن واضح نہیں ہے۔ وہ اکثر یہ کہتے ہیں کہ ہم امن چاہتے ہیں۔ لیکن ہم انصاف کے ساتھ امن (**السلام مع العدل**) چاہتے ہیں۔ یہ سوچ غیر فطری ہے۔ اِس سوچ کے تحت کسی کو نہ کبھی امن ملے گا اور نہ انصاف۔ انصاف امن کا حصہ نہیں ہے، بلکہ وہ خود اپنی جدوجہد سے کسی کو ملتا ہے۔

اصل یہ ہے کہ آپ پہلے یک طرفہ بنیاد (unilateral basis) پر امن قائم کیجئے۔ امن قائم ہوتے ہی ہر قسم کے مواقع (opportunities) کھل جائیں گے۔ اِن موقع کا بھر پور استعمال کرکے آپ انصاف کو حاصل کر سکتے ہیں۔

ایک عالم سے گفتگو کرتے ہوئے میں نے کہا کہ عربی زبان میں قرآن کی جو تفسیریں لکھی گئی ہیں، وہ عام طور پر شانِ نزول یا اسبابِ نزول کی روایتوں کو لے کر لکھی گئی ہیں۔ اِس طرزِ تفسیر نے قرآن کو بہت محدود کر دیا ہے۔ اسبابِ نزول کی حیثیت ایک وقتی حوالہ (immediate reference) کی ہوتی ہے۔ صرف اسی کو بناءِ تفسیر قرار دینا، قرآن کو محدود کرنے کے ہم معنیٰ ہے۔

مثال دیتے ہوئے میں نے کہا کہ قرآن (الکھف: 71) میں بتایا گیا ہے کہ خضر نے ایک کشتی کے تختہ کو نکال کر اس کو عیب دار بنا دیا۔ شانِ نزول کے مطابق، مفسرین نے اِس واقعے کو

صرف ایک مخصوص کشتی کے ساتھ متعلق سمجھا ہے، مگر یہ تفسیر قرآن کو محدود کرنے کے ہم معنیٰ ہے۔ اِس کا مطلب دراصل یہ ہے کہ موجودہ دنیا میں بار بار ایسا ہوتا ہے کہ کسی آدمی کی زندگی میں ایک ایسا واقعہ پیش آتا ہے جو بظاہر ناگوار واقعہ ہوتا ہے، لیکن اِس واقعے کے پیچھے اللہ تعالیٰ کا گہرا منصوبہ ہوتا ہے۔ فوری طور پر ایسے واقعے کی توجیہہ سمجھ میں نہیں آتی، لیکن آدمی اگر انتظار کرے تو کچھ دن کے بعد وہ خود سمجھ لے گا کہ ایسا ہونا اس کے حق میں بہتر تھا۔ ایسا واقعہ اس کے لیے زحمت میں رحمت (blessing in disguise) کے ہم معنی تھا۔

20 اکتوبر 2009 کی صبح کو میں ہوٹل کی بالکنی پر بیٹھا ہوا تھا۔ سامنے کی سڑک پر چمک دار کاریں دوڑ رہی تھیں۔ اوپر کی فضا میں کبھی کبھی ہوائی جہاز کے اڑنے کی آواز آتی تھی۔ ہوٹل کے ایک طرف شان دار عمارتیں پھیلی ہوئی تھیں۔ اِس منظر کو دیکھ کر میں نے اپنے ایک ساتھی سے کہا کہ میرا یہ حال ہے کہ جب میں خوب صورت کاروں کو سڑکوں پر دوڑتے ہوئے دیکھتا ہوں، جب میں ہوائی جہاز کو فضا میں اڑتے ہوئے دیکھتا ہوں، جب میں پُر رونق شہروں کو دیکھتا ہوں، تو میں سوچنے لگتا ہوں کہ خدا کی قدرت کتنی عجیب ہے اُس نے مادّی دنیا کے اندر ایسے امکانات رکھے جن کو دریافت کرکے ایک شان دار تہذیب وجود میں لائی جاسکے۔

پھر خدا کی یہ قدرت کتنی عجیب ہے کہ اُس نے انسان کو دماغ عطا کیا جس کو استعمال کرکے انسان یہ تمام کارنامے انجام دے سکے۔ میں نے کہا کہ ہوائی جہاز خدا کی قدرت کا اڑتا ہوا نشان ہے۔ ٹیلی فون خدا کی قدرت کا بولتا ہوا نشان۔ حقیقت یہ ہے کہ پوری تہذیب خدا کی قدرت کا ایک زندہ نشان ہے۔ مگر معرفت سے محرومی کی بنا پر لوگوں کا حال یہ ہے کہ وہ تہذیب کی ترقیوں کو انسان کا کرشمہ سمجھتے ہیں، نہ کہ خداوندِ ذوالجلال کا کرشمہ۔

قرآن کی سورہ نمبر 47 میں جنت کے بارے میں کہا گیا ہے: **یُدخلهم الجنة عرّفها لهم (محمد: 6)**۔ جنت اگلی دنیا میں انسان کے سامنے آئے گی، لیکن اِس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ جنت کا ابتدائی تعارف موجودہ دنیا ہی میں کردیا جائے گا۔ میں سمجھتا ہوں کہ جدید ٹکنالوجی نے

یہی کام انجام دیا ہے۔ جدید ٹکنالوجی نے جو تہذیب پیدا کی ہے، وہ ایک اعتبار سے، آنے والی جنت کا ابتدائی تعارف ہے۔

مولانا ابوصالح انیس لقمان ندوی کا حافظہ بہت اچھا ہے۔ اُن کو واقعات بہت زیادہ یاد رہتے ہیں۔ انھوں نے ایک مصری لطیفہ بتایا۔ انھوں نے بتایا کہ مصری لوگ لطیفہ بنانے کے ماہر ہوتے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ مصر کے سابق شاہ فاروق (وفات: 1965) نے ایک فورڈ کار منگائی۔ وہ خود اس کو چلانے لگے۔ اُن کا مصاحب بھی ان کے ساتھ گاڑی میں موجود تھا۔ شاہ فاروق کو ڈرائیونگ کا زیادہ تجربہ نہ تھا۔ گاڑی چلاتے ہوئے انھوں نے گاڑی کو ایک درخت سے ٹکرا دیا۔ اُن کا مصاحب اِس کے بعد فوراً گاڑی سے اترا اور اس نے مودبانہ انداز میں شاہ فاروق سے کہا: **الخطأ ليس في قيادتك، وإنما الخطأ في مَن غرس هٰذا الشجرة في هٰذا المكان**۔ (جناب، غلطی آپ کی ڈرائیونگ میں نہیں ہے، بلکہ غلطی اُس شخص کی ہے جس نے اِس مقام پر یہ درخت لگایا)۔

اِس لطیفے کا ایک پہلو یہ ہے کہ عرب دنیا میں آزادیٔ فکر نہ ہونے کا یہ عظیم فقدان ہوا ہے کہ عربوں میں فکری ارتقا (intellectual development) کا عمل جاری نہ ہوسکا۔ لطیفہ بنانا تو وہ جانتے ہیں، لیکن وہ تخلیقی معنوں میں کوئی علمی بات نہیں کہہ سکتے۔ سعودی عرب کے بارے میں ایک شیخ نے کہا تھا: **السعودية مقبرة لعلماء المسلمين** (سعودیہ مسلم علماء کا قبرستان ہے)۔ مذکورہ شیخ نے یہ بات دینی زوال کے معنوں میں کہی تھی، لیکن یہ بات فکری زوال کے بارے میں زیادہ صحیح ہے۔

قطر میں شیریٹن ہوٹل (Sheraton) میں مجھ کو ٹھیرنے کے لیے کافی بڑی جگہ دی گئی تھی۔ میرے دو ساتھیوں کے لیے دو الگ الگ روم تھے۔ میرے قیام کے لیے ماڈرن انداز کا ایک بڑا سوئٹ (Suite) تھا۔ کھانے کا نہایت اعلیٰ انتظام تھا۔ یہ ہوٹل بحرِ عرب کے کنارے بنایا گیا ہے۔ اِس طرح میرا سوئٹ ساحل کے بالکل کنارے تھا۔ یہاں کے خارجی مناظر بھی کافی شان دار تھے، مگر مجھے مسلسل طور پر ایک نامعلوم قسم کی بے سکونی لاحق تھی۔ مجھے ایک لمحہ بھی یہاں خوشی محسوس نہیں ہوتی تھی۔ میں نے سوچا کہ اِس کا سبب کیا ہے۔ میری سمجھ میں آیا کہ اِس کا سبب غالباً یہ ہے کہ یہ دنیا ایک

محدود اور غیر کامل دنیا ہے، جب کہ انسان ایک لامحدود ذہن لے کر پیدا ہوتا ہے۔ اِس لیے اس دنیا کی کوئی بھی چیز انسان کو کامل معنوں میں مسرت نہیں دے سکتی۔ اِس دنیا میں ہر صورت حال کے ساتھ حزن (sorrow) لازمی طور پر لگا ہوا ہے۔ جنت کی سب سے بڑی نعمت یہ ہوگی کہ وہاں حزن کا خاتمہ ہو جائے گا۔ چناں چہ قرآن میں آیا ہے کہ اہلِ جنت جب جنت میں پہنچیں گے تو وہ کہیں گے: **الحمد لله الذی أذهب عنّا الحزَن (فاطر: 34)**۔

اِس آیت سے بلاغت کا ایک نکتہ معلوم ہوتا ہے۔ قرآن کی اِس آیت میں "**حـــزَن**" کا لفظ آیا ہے۔ قرآن کی ایک اور آیت میں اِس کے بجائے **حُـزْن** (یوسف: 86) کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ یہ کوئی پراسرار بات نہیں۔ لغوی اعتبار سے حُزن اور حزن دونوں بالکل ہم معنیٰ الفاظ ہیں۔ مذکورہ دونوں آیتوں میں اُن کا استعمال اصولِ بلاغت کی بنا پر ہے، کیوں کہ صوتی آہنگ کے اعتبار سے، ایک جگہ **حُزن** کا لفظ زیادہ مناسب ہے اور دوسری جگہ حزَن کا لفظ۔ یہ فرق صرف صوتی آہنگ کی بنا پر ہے، نہ کہ کسی پراسرار سبب کی بنا پر۔

ایک صاحب سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے اپنی ماں کی بہت تعریف کی۔ میں نے کہا کہ یہ آپ کی ماں کی بات نہیں، ہر آدمی اپنی ماں کے ساتھ اُسی طرح حبِّ شدید کا تعلق رکھتا ہے، جس طرح آپ کو اپنی ماں کے ساتھ حب شدید کا تعلق ہے، لیکن میں اِس کو صرف بے خبری کا ایک کیس سمجھتا ہوں۔

میں نے کہا کہ لوگوں کو اپنی ماں کے ساتھ حب شدید کا تعلق کیوں ہوتا ہے۔ اِس کا سبب یہ ہے کہ وہ دیکھتے ہیں کہ ان کی ماں کے پیٹ سے ان کا جنم ہوا، پھر وہ دیکھتے ہیں کہ پیدا ہونے کے بعد ان کی ماں نے ان کو پالا پوسا۔ مگر یہ ایک بے بصیرتی کی بات ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ حب شدید کا تعلق آدمی کو صرف خدا سے ہونا چاہیے۔ خدا کے آپ کے اوپر جو احسانات ہیں، وہ بلین ٹریلین سے بھی زیادہ ہیں۔ آپ کو پیدا کرنے والی آپ کی ماں نہیں ہے، یہ دراصل خدا ہے جس نے آپ کی تخلیق کی۔ خدا نے آپ کو **صوّرکم فأحسن صُورکم (المؤمن: 64)** کا درجہ دیا۔ پیدا ہونے کے بعد بھی یہ دراصل خدا ہے جو اِس کی پرورش یا تربیب (upbringing) کرتا ہے۔ یہ خدا ہے جس نے آپ کو لائف سپورٹ سسٹم دیا۔ حقیقت

یہ ہے کہ آپ کی زندگی میں 99 فی صد سے زیادہ حصہ خدا کا ہے اور ایک فی صد سے بھی کم حصہ آپ کی ماں کا۔ ایسی حالت میں آپ کے اندر حب شدید کا تعلق خدا سے ہونا چاہئے، نہ کہ اپنی ماں سے۔ مگر عجیب بات ہے کہ اِس معاملے میں تمام دنیا کے لوگ اندھے پن کی حد تک بے خبری میں مبتلا ہیں۔

یہاں مجھ پر عجز کا ایک تجربہ گزرا۔ اس کے بعد میری زبان سے یہ دعاء نکلی— خدایا، تو نے انسان کو عجز کے ساتھ پیدا کیا۔ ساری قدرت تیری طرف اور سارا عجز انسان کی طرف۔ ایسی حالت میں تو انسان کے معاملے میں غیر جانب دار (indifferent) نہیں ہوسکتا۔ یہ تیری شانِ خداوندی کے خلاف ہے کہ تیرے اور انسان کے درمیان عجز اور غیر جانب داری (indifference) کا تعلق ہو۔ ایسا تعلق ''قسمۃ ضیزیٰ'' کا مصداق بن جائے گا۔ ضروری ہے کہ خدا اور بندے کے درمیان محروم اور معطی کا تعلق ہو۔ یہی تعلق خدائے رحمان اور رحیم کی شان کے مطابق ہے۔

ایک حدیث میں ایک لمبی دعا آئی ہے، اُس کا ایک حصہ یہ ہے: **اللھم إنّي أسئلك بحقّ السائلين عليك** (مسند احمد، جلد 3، صفحہ 21)۔ اِس پیغمبرانہ دعاء سے معلوم ہوتا ہے کہ سائل اگر حقیقی سائل ہے تو اس کا بھی کچھ حق ہوتا ہے، جس طرح بندوں کے اوپر اللہ کے حقوق ہیں، اُسی طرح بندوں کا بھی اللہ کے اوپر کچھ حق ہے۔ تاہم یہ ایک بے حد نازک بات ہے۔ اِس حقیقت کو صرف وہ لوگ سمجھ سکتے ہیں جو معرفت کے اعلیٰ درجے پر پہنچ چکے ہوں۔

کئی لوگوں سے قیامت کے بارے میں گفتگو ہوئی۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ سیکولر لوگ جو سائنس کا علم رکھتے ہیں، وہی اِس بارے میں سوچتے ہیں۔ جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے، وہ قیامت کے معاملے میں بالکل بے خوف ہیں۔ مسلمانوں کی نفسیات یہ ہوتی ہے کہ ان کے خیال کے مطابق، مہدی اور مسیح تو ابھی آئے نہیں، پھر اِس سے پہلے قیامت کیسے آجائے گی۔ اور اگر قیامت آتی ہے تب بھی مسلمانوں کے لیے وہ کوئی مسئلہ نہیں، کیوں کہ مسلمان امتِ مرحومہ سے نسبت رکھتے ہیں۔

عجیب بات ہے کہ ہالی وڈ (Hollywood) نے ایک فلم بنائی ہے۔ اس کا نام یہ ہے:

2012 End of the world

اِس انگریزی فلم میں قیامت کے مناظر دکھائے گئے ہیں۔ اس فلم میں بتایا گیا ہے کہ قیامت 21 دسمبر 2012 کو آئے گی۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ مشہور سائنس داں آئن سٹائن (وفات: 1955) نے بھی کہا تھا کہ 2012 تک قطبین (South Pole, North Pole) کی برف پگھلنے کی وجہ سے زمین پر پول شفٹ (pole shift) کا واقعہ پیش آئے گا۔ اِس فلم میں ایک سائنس داں بول کر کہتا ہے کہ — قیامت قریب آرہی ہے، کیوں کہ انسان خدا کے قانون پر نہیں چلا:

Doomsday is coming because man
does not follow the path of God.

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ قیامت اچانک (بغتةً) آئے گی (الأعراف: 187)۔ اِس لیے 21 دسمبر 2012 کی محدّد پیشین گوئی درست نہیں ہوسکتی، البتہ یہ بات درست معلوم ہوتی ہے کہ قیامت بہت زیادہ قریب آچکی ہے۔ ممکن ہے کہ وہ اکیسویں صدی عیسوی کے ربع اوّل ہی میں آجائے۔

ایک مجلس میں مسلمانوں کی موجودہ عالمی حالت پر گفتگو ہوئی۔ میں نے کہا کہ موجودہ زمانے کے مسلمان، عرب اور غیر عرب دونوں، ایک ذہنی واہمہ (obsession) میں مبتلا ہیں اور وہ ہے، عظمتِ رفتہ کی واپسی۔ میں نے کہا کہ یہ ایک جاہلی مزاج ہے۔ وسیع تر پہلو سے دیکھا جائے تو انسان کا کیس جنتِ رفتہ کی واپسی کا کیس ہے، نہ کہ دنیوی معنوں میں عظمتِ رفتہ کی واپسی کا کیس۔

ایک عرب خاتون لیما نبیل نے اسپین کا سفر کیا۔ وہاں مسلم عہد کی قدیم عمارتوں میں اُن کو عرب کی عظمتِ رفتہ نظر آئی۔ اس کو دیکھ کر وہ رو پڑیں۔ انھوں نے کہا: **إلی متی سیستمر هٰذا اللیل العربی** (عرب کی یہ تاریک رات آخر کب تک باقی رہے گی)۔

یہی موجودہ زمانے کے تمام مسلمانوں کا حال ہے۔ ہر ایک قدیم سیاسی عظمت کے تصور میں گم ہے۔ اسپین کی عرب سلطنت 1492 میں ختم ہوئی، انڈیا کی مغل سلطنت 1857 میں ختم ہوئی، ترکی کی عثمانی خلافت 1929 میں ہوئی۔ یہ مسلم ایمپائر کے دور کی باتیں ہیں۔ ساری دنیا کے مسلمان اِن واقعات کو پڑھتے ہیں اور اس کی واپسی کا خواب دیکھتے رہتے ہیں۔

یہ بلاشبہہ ایک جاہلیت ہے۔ نہ صرف مسلمان، بلکہ تمام انسانوں کا اصل مسئلہ یہ ہے کہ انسان کی تخلیق کے بعد اس کو جنت میں رکھا گیا، پھر اس کو وہاں سے نکال دیا گیا۔ اب مسلمان سمیت تمام انسانوں کا اصل مسئلہ یہ ہے کہ ان کو جنت میں دوبارہ واپسی ملے، مگر شیطان نے ہر ایک کو بھٹکا کر ان کو اصل مسئلے سے غافل بنا رکھا ہے۔

ایک صاحب نے کہا کہ آپ اپنے کام کو دعوت الی اللہ کا کام بتاتے ہیں، لیکن مجھے بتایا گیا ہے کہ آپ کلمہ نہیں پڑھاتے۔ آخر یہ کیسی دعوت ہے جس میں کلمۂ شہادت کی ادائیگی نہیں۔ انھوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک داعی تھے۔ آپ کا طریقہ یہ تھا کہ آپ لوگوں کو کلمہ پڑھا کر اسلام میں داخل کرتے تھے، پھر یہ آپ کی کون سی دعوت ہے جس میں کلمہ پڑھانا نہیں۔

میں نے کہا کہ آپ کو یہ غلط فہمی سلیکٹیو رپورٹنگ (selective reporting) کی بنا پر ہے، یعنی کچھ اجزا کو بتانا اور کچھ اجزا کو نہ بتانا۔ میں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے مشن میں کلمہ پڑھانے سے دعوت کا آغاز نہیں کرتے تھے، بلکہ شعوری بیداری سے آغاز کرتے تھے جس کو معرفت کہا جاتا ہے۔ رسول اللہ کی دعوت تمام تر قرآن پر مبنی تھی۔ آپ افراد کے سامنے بھی اور مجمع میں بھی یہی کرتے تھے کہ آپ لوگوں کو قرآن پڑھ کر سناتے تھے (**عرض علیهم الإسلام، وقرأ علیهم القرآن**)۔ آپ کا اصل دعوتی کام یہی تھا۔ اِس کے بعد جن لوگوں کا ذہن بدل جاتا اور وہ دائرہ اسلام میں داخل ہونے کی خواہش ظاہر کرتے تو آپ کلمہ شہادت کی ادائیگی کے بعد ان کو دائرہ اسلام میں داخل کر لیتے۔ یہی وجہ ہے کہ سارے قرآن میں دعوت کی باتیں تو ہیں، لیکن قرآن میں یہ نہیں بتایا گیا ہے کہ لوگوں سے کلمہ شہادت پڑھوا کر ان کو دائرہ اسلام میں داخل کرو۔

قطر کے زمانۂ قیام میں جو دعوتی کام ہوئے، اُن میں سے ایک یہ تھا کہ پروفیسر ابراہیم صالح النعیمی کو ہمارے ساتھیوں نے تذکیر القرآن کے عربی ایڈیشن (**التذکیر القویم فی تفسیر القرآن الحکیم**) کا ایک سیٹ بطور ہدیہ پیش کیا۔ اس کو انھوں نے شکریہ کے ساتھ قبول کیا۔ پروفیسر صالح النعیمی **مرکز الدوحة الدولی لحوار الأدیان** کے ڈائریکٹر ہیں۔

تذکیر القرآن کا یہ عربی ایڈیشن تین جلدوں پر مشتمل ہے۔ وہ 2008 میں دار الوفاء (المنصورہ، مصر) سے چھپا ہے۔ اِس ادارے نے راقم الحروف کی ایک اور کتاب ''خاتونِ اسلام'' کا عربی ترجمہ (المرأة بین شریعة الإسلام وحضارة الغرب) شائع کیا ہے۔ ادارے کا مکمل پتہ یہ ہے:

دار الوفاء للطباعة والنشر والتوزيع، جمهورية مصر العربية، المنصورة
ش الإمام محمد عبده المواجهة لكلية الآداب، ص ب: 230
Tel: +2050 22 56 230, Fax: +20502260 974
e.mail: darelwafa@hotmail.com
www.darelwafaa.com

دار الوفاء (مصر) کا اپنا ویب سائٹ ہے۔ اِس ویب سائٹ پر تذکیر القرآن کے عربی ایڈیشن کا تعارف اِن الفاظ میں دیکھا جاسکتا ہے:

- إن الغرض الرئيسى من هذا التفسير بصفة خاصة، هو (التذكير بالقرآن) ومن حيث أن القرآن نفسه إنما جاء من أجل تحقيق هذه الغاية، أى التذكير و الموعظة، فإن الجانب الذى أولاه المؤلف القسط الاوفر من إتمامه، فى طرح مضامين هذا التفسير هو أن يجد فى القارى منهلا فياضا أومرتعا خصبا يضمن له اشباع حاجته إلى التذكير والاعتبار والاتعاظ۔
- وحاول المؤلف اتباع اسلوب الفقرات فى طرح مضامين هذا التفسير أى أنه عمد إلى فقرة من فقرات القرآن، ثم تناول ما يندرج تحتها من فكرة أو توجيه معنوى بالتفسير والإيضاح كموضوع متسلسل، وذلك حرصا منه على ألاتنقطع من القارئ سلسلة المعانى والمفاهيم المطروحة خلال قراءته فى فقرة تفسيرية معينة، ولكى يتمكن من التزود المستمر المتواصل (بالغذاء التذكيرى) للقرآن الكريم۔
- ولقد توخى المؤلف الشيخ وحيد الدين خان في إعداد (تذكير القرآن) من الحكمة، ما جعل كل فقرة من فقراته، مستقلة بذاتها، وذلك لاحتوائها على فكرة قرآنية واضحة محدّدة، فسواء قرأ القارى صفحة واحدة من التفسير، أم

قـرأ مـجموعة كبيرة من الصفحات، فإنه لا يكد ينتهى من قراء ته إلا ويكون قد ظفر بنصيب من (الموعظة القرآنية) على أية حال۔

- وقـد توخى الايجاز إلى الحد الممكن، غير عارض للتفاصيل المتصلة بالجانب الـلـغـوى، أو الجانب الفقهى أو الجانب الكلامى، أو ما إلى ذلك من الجوانب والوجوه الأخرى للمدلول القرآنى، وإنما الشئ الذي جعله نصب عينيه، هو أن يتسم تفسير القرآن بطابع من البساطة التى يتميز بها القرآن نفسه، فإن القرآن، مـن جهـة يـعـكـس جلال الله وعظمته، ومن جهة أخرى، هو مرآة تنعكس عليه عبـوديـة الإنسـان بـجـمـيـع نـواحيهـا، وهذه هى النقاط الجوهرية التي يتمحور حـولهـا هـذا التـفسيـر، ويـحـاول تـجـليتهـا بأسلوب موجز وبسيط، بعيدا عن التعقيدات الفنية۔

تذکیر القرآن کا یہ عربی ترجمہ مولانا ابوصالح انیس لقمان ندوی نے کیا ہے۔ وہ مالے گاؤں (مہاراشٹر) میں 1965 میں پیدا ہوئے۔ اب وہ ابوظبی (عرب امارات) میں رہتے ہیں۔ ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ان کو عربی زبان سے عشق ہے۔ عربی کے علاوہ، وہ انگریزی زبان میں بھی لکھنے پڑھنے اور بولنے کی پوری صلاحیت رکھتے ہیں۔

موجودہ زمانے میں عام طور پر عربوں کا مزاج یہ ہے کہ وہ لکھنے میں تو فصیح عربی لکھتے ہیں، لیکن بولنے میں اکثر وہ غیر فصیح زبان بولتے ہیں۔ مولانا انیس لقمان ندوی کو عربوں کا یہ مزاج پسند نہیں۔ انھوں نے بتایا کہ 22 جون 1998 کو ابوظبی میں ڈاکٹر عزالدین ابراہیم سے ان کی ملاقات ہوئی۔ اِس دوران اُن سے مختلف موضوعات پر گفتگو ہوئی۔ ابتدا ہی میں میں نے اُن سے درخواست کی کہ وہ مجھ سے صرف فصیح عربی میں بات کریں، کیوں کہ میں فصیح عربی کے معاملے میں اُس سے زیادہ غیور ہوں جتنا غیور کوئی مرد اپنی بیوی کے معاملے میں ہوتا ہے۔ اگر آپ مجھے فصحیٰ میں گالی دیں تو یہ بات مجھے اس سے زیادہ پسند ہے کہ آپ عامی زبان میں میری تعریف کریں (كـلّـمـنـي مـن فضلك بـالعربية الفُصحىٰ، فإنّي والله أغار على اللغة العربية الفصحىٰ أكثر مما يغار الرجل

علـى زوجتـه۔ ولو شتمتنى بالفصحیٰ، فإنّه أحبّ إليّ من أن تمدحنى بالعامية) ۔اِس بات کوسن کر ڈاکٹر عز الدین ابراہیم بہت محظوظ ہوئے۔ انھوں نے کہا کہ یہ بات آپ نے اتنے خوب صورت پیرائے میں کہی ہے کہ وہ اِس قابل ہے کہ ضرب المثل بن جائے (إنّ کـلامك هـٰذا مصوغ صياغة رائعة لدرجة أنه ليكاد أن يكون مضرب المثل)۔

ریاض، کویت، بیروت اور قاہرہ سے راقم الحروف کی مختلف عربی کتابوں کے ترجمے شائع ہو چکے ہیں جن کی مجموعی تعداد تقریباً 40 ہوتی ہے۔ تذکیر القرآن کا عربی ترجمہ المنصورہ (مصر) سے چھپا ہے۔ اِس عربی ترجمہ کی تحریک ابتداءً ایک عرب عالم محمد سلیمان القائد نے کی تھی۔ اس کے بعد مولانا انیس لقمان ندوی نے اس کا عربی ترجمہ کیا اور پھر دو عرب شخصیتوں، استاد صالح شوکات اور دکتور عبدالحلیم عویس، کی کوششوں سے وہ چھپ کر شائع ہوا۔

شیخ سلیمان القائد کا خیال تھا کہ عالمِ عرب میں راقم الحروف کی کتاب ''الإسلام يتحدّى'' کی اشاعت سے اسلام اور سائنس کے متعلق میرے افکار پھیلے، لیکن ابھی تک وہاں میرے دعوتی افکار عام نہ ہو سکے۔ تذکیر القرآن کے عربی ایڈیشن کی اشاعت ان شاء اللہ دعوتی افکار کی اشاعت میں معاون ہوگی۔ الرسالہ کے دعوتی مشن سے شیخ سلیمان القائد کی گہری وابستگی کا اندازہ ان کے حسب ذیل اقتباس سے کیا جا سکتا ہے۔ یہ اقتباس اسلامی مرکز (نئی دہلی) میں 31 اگست 1984 میں کی گئی ان کی ایک تقریر سے ماخوذ ہے:

''ولـعـلك تسئل بعد هذا، لماذا أحببتَ وحيد الدين۔ الحقيقة أن اكتشاف الشيـخ وحيـد الدين أعظم اكتشاف في حياتي۔ فالفضل يرجع إلى الله أوّلاً، ثمّ إلى وحيـد الـديـن خـان في اكتشاف حقيقة الدعوة إلى الله۔ فهو أضاء لي الطريق الذي جعل به حياتي ذات معنىً۔ وأ كثـر مـن هٰذا، فإنّني أحسب نفسي بكلّ تواضع أنّني مـجرّد تلميذ صغير جداً في مدرسة هٰذا لعالم الرباني۔ والمسلمون حالياً لايعرفونه ، وهٰـذا أعـظـم مـأسـاة۔ فـالـمسـلـمـون يـعيشون في وَهم الشخصيات ذات البريق التـاريـخـي والبهـرجـة الـدُنيـوية فهم ينظرون إلى كثرة الأتباع، والشهرة، وفخامة

المؤسسات۔ ولكن هنيئا لكل امرئ مَن عرفه وأدرك قيمة رسالته۔ وإنها لرحمة ربّانية نادرة جدا أن يخرج فينا الآن مثله في وقتٍ نحن في أشدّ الحاجة إلى مَن يُبصرنا طريق النجاة، فهو المجدد بحق لدين الله الذي انتظرناه منذ مئات السنين۔ والله وحده يشده على صدق ماأقول، وإنّي أعلن شهادتي هذا متحديا بها العصر الحاضر ومستقبل التاريخ الإسلامي والإنساني بأسره"۔ (محمد سليمان القائد، المركز الثقافي الإسلامي بكيجالي، إفريقيا)

ایک صاحب سے گفتگو کرتے ہوئے میں نے کہا کہ بیماری اورصحت انسانی زندگی کا لازمی حصہ ہیں،مگر یہ کوئی سادہ بات نہیں۔حقیقت یہ ہے کہ اِس معاملے کا ایک بڑا مثبت پہلو ہے۔ایک شدید بیماری کے بعد جب آدمی کوصحت حاصل ہوتی ہے تو یہ جزئی معنوں میں اُس حقیقت کا تجربہ ہوتا ہے جس کوقرآن میں اِن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: وقد خلقتُك من قبل ولم تك شيئا (مريم: 9)۔

یہ ہر انسان کا معاملہ ہے کہ پیدائش سے پہلے وہ غیر موجود تھا۔ پیدائش کے بعد وہ وجود میں آ گیا۔ یہ ایک حیرت ناک واقعہ ہے۔مگر آدمی اپنے بارہ میں اِس طرح سوچ نہیں پاتا۔ وہ اپنے وجودکو فارگرانٹیڈ (for granted) طور پر لئے رہتا ہے۔ اِسی بنا پر انسان کوشدید بیماری میں مبتلا کیا جاتا ہے اور پھراس کوصحت دی جاتی ہے۔ یہ انسان کے ساتھ رحمت کا ایک معاملہ ہے۔ اِس تجربے کی صورت میں خدا یہ چاہتا ہے کہ انسان اپنے بارے میں خدا کی اِس عنایت کودریافت کرے کہ اُس نے ایک غیرموجود انسان کوموجود انسان بنا دیا۔ اِس رحمتِ خداوندی کو شدت کے ساتھ محسوس کرنے کے بعد ہی یہ ممکن ہے کہ آدمی شکرِ خداوندی کا گہرا احساس کرے، وہ شکر کے جذبے سے سرشار ہوجائے۔

ایک صاحب سے میں نے پوچھا کہ کیا آپ نے کبھی اپنی تخلیق کو لے کرسوچا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا کیسا عجیب معاملہ ہے کہ میں ایک غیر موجود شخص تھا، پھر میں وجود میں آ گیا۔ میں اچانک ایک ایسا زندہ انسان بن کر زمین پر چلنے پھرنے لگا جو سوچتا ہے، جو دیکھتا ہے، اور دوسرے بہت سے کام کرتا ہے۔انھوں نے کہا کہ اِس طرح میں بہت کم سوچتا ہوں۔

میں نے کہا کہ اِس طرح کے معاملے میں کم سوچنے کا مطلب ہوتا ہے نہ سوچنا۔ ایک انسان کی حیثیت سے وجود میں آنا اتنا بڑا واقعہ ہے کہ اُس پر کم درجے میں سوچا نہیں جا سکتا۔ جب بھی کوئی شخص اِس پر سوچے گا تو وہ بڑے درجے میں سوچے گا۔ مثلاً ایک فقیر کو کوئی شخص اچانک ایک بلین ڈالر دے دے اور آپ اُس سے اس کا احساس پوچھیں تو وہ یہ نہیں کہے گا کہ ہاں، تھوڑا تھوڑا محسوس ہو رہا ہے، بلکہ وہ سرشاری کے انداز میں اپنی لغت کے تمام الفاظ استعمال کر ڈالے گا۔

میں نے کہا کہ ایک مرتبہ میں نے امریکی میگزین ریڈر ڈائجسٹ میں ایک مضمون پڑھا تھا۔ اُس میں بتایا گیا تھا کہ سعودیہ میں جب تیل نکلا تو ایک عرب بدو کو اچانک بہت زیادہ دولت حاصل ہوگئی۔ اس کے ایک دوست نے اس کے پیسے سے سوئزر لینڈ میں اس کے لیے شان دار مکان خریدا، پھر وہ اِس عرب کو ہوائی جہاز کے ذریعے سوئزر لینڈ لے گیا اور اُس عرب کو اِس نئے مکان میں داخل کرکے کہا کہ یہ تمھارا مکان ہے۔ اُس وقت اُس عرب کا عجیب حال ہوا۔ مضمون میں بتایا گیا تھا کہ وہ عرب بار بار اپنے آپ کو چھو کر دیکھتا تھا اور پھر اس مکان کو چھو کر دیکھتا تھا اور کہتا تھا کہ کیا واقعی یہ میں ہوں اور یہ مکان میرا مکان ہے۔

زیادہ بڑی معرفت یہ ہے کہ آپ کو خود اپنے بارے میں اِسی قسم کا انوکھا احساس ہونے لگے۔ آپ اپنے آپ کو دیکھیں اور اپنے آس پاس کی دنیا کو دیکھیں اور حیرت کے ساتھ سوچیں کہ کیا یہ واقعی میں ہوں اور کیا یہ دنیا میری دنیا ہے جس میں مجھے رہنے کا موقع دیا گیا ہے — لوگوں کے اندر اعلیٰ معرفت نہیں، اِس لیے لوگوں کے اندر اعلیٰ شکرِ خداوندی کا جذبہ بھی نہیں۔

قطر کے حوالے سے ایک خبر نگاہ سے گزری۔ اِس خبر میں بتایا گیا تھا کہ تاجکستان کے صدر امام علی رحمانوف کے بیان کے مطابق، تاجکستان کے دار الخلافہ (دوشنبہ) میں دنیا کی سب سے بڑی مسجد تعمیر کی جائے گی۔ بیان کے مطابق، اِس مسجد کو اٹھارہ ایکڑ زمین پر تعمیر کیا جائے گا۔ اِس مسجد میں بیک وقت ڈیڑھ لاکھ نمازیوں کی گنجائش ہوگی۔ آئندہ سال اِس مسجد کی تعمیر کا آغاز کیا جائے گا۔ اِس مسجد کی تکمیل پر پانچ سال درکار ہوں گے۔ اِس مسجد کی تعمیر کے تمام اخراجات

دبئ اور قطر کی حکومت نے ادا کرنے کا وعدہ کیا ہے۔

آج کل ہر جگہ شان دار مسجدیں تعمیر کی جارہی ہیں۔فخر کے ساتھ ان کا تذکرہ کیا جارہا ہے، حالاں کہ حدیث کی پیشین گوئی کے مطابق، یہ کوئی فخر کی چیز نہیں۔ایک روایت کے مطابق، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: **ما اُمرتُ بتشييد المساجد (أبو داؤد، كتاب الصلاة، با ب في بناء المساجد)** یعنی مجھ کو بلند وبالا مسجدیں بنانے کا حکم نہیں دیا گیا ہے۔ایک اور روایت کے مطابق، حضرت انس کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ میری امت پر ایک ایسا زمانہ آئے گا کہ لوگ مسجدوں پر فخر کریں گے، مگر وہ اس کو (ذکر اور نماز سے) بہت کم آباد کریں گے **(يأتي علىٰ أمتي زمان يتباهون بالمساجد، ثم لا يعمّرونها إلاّ قليلاً)** فتح الباری، جلد 1، صفحہ 642۔

بلند وبالا عمارت اگر آدمی کو جنت کی یاد دلائے، وہ یہ سوچے کہ جب دنیا میں اِس قسم کی خوب صورت عمارت بن سکتی ہے تو جنت کی عمارتیں کتنی زیادہ خوب صورت ہوں گی۔اگر ایسا ہو تو یہ ایک قابلِ قدر بات ہوگی۔لیکن اگر بلند وبالا عمارت آدمی کے مادی ذہن میں اضافہ کرے تو وہ بلاشبہہ آدمی کے لیے ایک وبال بن جائے گی۔جیسا کہ حدیث میں آیا ہے: **كلّ بناء وبالٌ على صاحبه إلاّ مالا، إلاّ مالا (أبو داؤد، كتاب الأدب، باب ما جاء في البناء)۔**

کرنل شیخ عیسیٰ (77 سال) انڈیا میں پیدا ہوئے، پھر وہ پاکستان چلے گئے۔آج کل وہ قطر میں رہتے ہیں۔ان سے ملاقات ہوئی۔وہ دینی مزاج کے آدمی ہیں۔انھوں نے کہا کہ میں بہت دن سے مختلف انگریزی ترجموں کی مدد سے قرآن کو پڑھتا تھا، لیکن مجھے کسی ترجمے پر اطمینان نہیں ہوتا تھا۔اِن ترجموں میں دو چیزیں مجھے پسند نہ تھیں — ایک، ان کی زبان اور دوسرے، ان میں وضوح (clarity) کا نہ ہونا۔انھوں نے کہا کہ آپ کے ادارے سے قرآن کا جو انگریزی ترجمہ چھپا ہے، وہ اِس معاملے میں ایک استثناء (exception) کی حیثیت رکھتا ہے۔اِس ترجمے کی زبان بھی وقت کے مطابق ہے، اور اس کے اندر وضوح (clarity) بھی پوری طرح پایا جاتا ہے۔

کرنل شیخ عیسی سے پاکستان کے بارے میں گفتگو ہوئی۔انھوں نے کہا کہ پاکستان میں

قیادت کا فقدان ہے، اور لیاقت علی خاں کے بعد کوئی صحیح لیڈر وہاں پیدا نہیں ہوا۔ میں نے کہا کہ اصل مسئلہ قیادت کے فقدان کا نہیں ہے، بلکہ اصل مسئلہ قبولیت (acceptance) کے فقدان کا ہے۔ پاکستان میں جنرل ایوب خاں بہترین لیڈر تھے، مگر پاکستانی عوام نے ان کو قبول نہیں کیا۔

20 اکتوبر 2009 کی صبح کو ہوٹل کے ایک بڑے ہال میں کانفرنس کے افتتاح کی کارروائی ہوئی۔ یہ ایک بہت بڑا اور شاہانہ انداز کا ہال تھا۔ ہر طرف کیمرے والے دوڑتے ہوئے نظر آتے تھے۔ عربی لباس کے لوگ ہر طرف چلتے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔ ہر طرف **السلام علیکم ورحمة الله، کیف الحال، متی القدوم، أهلاً و سهلاً** اور **بارك اللّٰه فیکم** جیسے الفاظ سنائی دے رہے تھے۔ اِس پروگرام کی کوآرڈنیٹر ایک سینئر عرب خاتون تھیں۔ اُن کا پورا بدن برقعہ سے ڈھکا ہوا تھا۔ ان کا نام یہ ہے: **الأستاذة الدکتورة عائشة یوسف المنّاعي، عمیدة کلیة الشریعة بجامعة قطر۔**

افتتاحی تقریر قطر کے ایک منسٹر احمد بن عبد اللہ المحمود نے کی۔ انھوں نے اپنی عربی تقریر میں جن باتوں پر زور دیا، وہ مختلف ادیان کے درمیان قدرِ مشترک کی تلاش تھی۔ انھوں نے کہا کہ قرآن اور حدیث وحدانیتِ خلق پر متفق ہیں۔ حدیث میں ارشاد ہوا ہے: **إنّ ربکم واحد، وإنّ أباکم واحد۔**

دوسرے مقررین نے عام طور پر رسمی انداز کی باتیں کیں۔ ایک مقرر نے کہا کہ ادیانِ سماوی کی یہ خصوصی ذمے داری ہے کہ وہ موجودہ زمانے کے انسانی مسائل میں ان کو رہنمائی دیں۔ انھوں نے کہا کہ ادیانِ سماوی سے وابستہ لوگ موجودہ عالمی آبادی کا 60 فی صد حصہ ہیں۔ ان کو چاہئے کہ وہ سب مل کر موجودہ مسائل پر سوچیں اور اس کا حل نکالنے کی کوشش کریں۔

یہاں ہر مقرر نے لکھی ہوئی تقریر پڑھی۔ صرف ایک صاحب نے انگریزی زبان میں تقریر کی۔ اس کے علاوہ تمام تقریریں عربی زبان میں ہوئیں۔ اِس پروگرام میں مسئلہ فلسطین کا بھی ذکر آیا، مگر مقررین کی طرف سے اس کا کوئی متعین حل سامنے نہ آسکا۔

افتتاحی پروگرام کے موقع پر عرب دنیا کے اکثر بڑے بڑے لوگ موجود تھے۔ اِس کے علاوہ شاہی خاندانوں کے کچھ افراد بھی یہاں آئے ہوئے تھے۔ عرب حکومتوں سے متعلق بڑے بڑے

افسران اور وزراء بھی اِس کانفرنس میں شریک تھے۔ میرے ساتھیوں نے اِن تمام لوگوں کو قرآن کا انگریزی ترجمہ اور دعوتی لٹریچر دیا۔ لوگوں نے اِس کو خوشی کے ساتھ قبول کیا۔

قطر کی اس کانفرنس میں تقریبا 15 پینل بنائے گئے تھے۔ ان کے عنوانات حسب ذیل ہیں:

- Human Solidarity:
  Human Action in Response to Wars and Disasters
- Achieving Unity and Solidarity through Spiritual Values
- Religious Responses to Natural Disasters and Famines
- Religious Views on Human Solidarity in Response to Wars
- Human Solidarity and Inter-dependence in Response to Wars
- Solidarity and Economic Inter-dependence:
  Religious Financial Systems and the Economic Crisis
- Solidarity and Economic Inter-dependence:
  Religious Analysis of the Economic Crisis and its Consequences
- Solidarity in Defense of Religious Rights and Freedom
- Solidarity in Support of Holy Sites
- Solidarity and Economic Inter-Dependence:
  Religious Responses to the Financial Crisis
- Responses in Defense of Religious Rights and Freedom
- Religious Responses for Supporting Holy Sites
- Round Table Discussion
- Closing Remarks & Recommendations

اِس کانفرنس میں ڈنمارک کے ایک نومسلم سے ملاقات ہوئی۔ ان کا نام یہ تھا:

Abdul-Wahid Anderson, Muslim council of Denmark

انھوں نے بتایا کہ ڈنمارک میں کارٹون کا جو واقعہ پیش آیا تھا، اس سے لوگوں کے اندر تجسس پیدا ہوا اور لوگوں نے اسلام کا مطالعہ کرنا شروع کر دیا۔ اِس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کارٹون کے واقعے کے بعد ڈنمارک میں 75 افراد نے اسلام قبول کرلیا۔

میں نے بتایا کہ کارٹون کے واقعہ کے بعد سعودی ٹی وی (عکاظ) کی ایک ٹیم ڈنمارک گئی تھی۔

یہ لوگ سیرتِ رسول کے موضوع پر راقم الحروف کی کتاب ''پیغمبر انقلاب'' کا انگریزی ترجمہ (Muhammad A Prophet for All Humanity) اپنے ساتھ لے گئے تھے۔اس کو انھوں نے بڑے پیمانے پر ڈنمارک کے مقامی لوگوں کو مطالعے کے لیے دیا۔

ہمارے یہاں سے چھپے ہوئے انگریزی ترجمہ قرآن کے بارے میں عام طور پر لوگوں نے مثبت رائے دی۔فرانس کے ایک صاحب کو 20 اکتوبر 2009 کو ہمارے ساتھی مسٹر رجت ملہوترا نے قرآن کا انگریزی ترجمہ دیا۔اس کو پڑھ کر اگلے دن انھوں نے میرے ساتھی مسٹر رامش صدیقی سے اس کے بارے میں اپنا تاثر بتاتے ہوئے کہا کہ میں نے اِس سے پہلے قرآن کے دو انگریزی ترجمے پڑھے تھے، لیکن کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔مگر آپ کا یہ ترجمہ قرآن پوری طرح سمجھ میں آرہا ہے۔ان کا نام یہ ہے:

Alain Micmel, Director General Mommes De Parole Faundation.

اگلے دن انھوں نے ترجمۂ قرآن کا ایک اور نسخہ طلب کیا جو انھیں دے دیا گیا۔

کانفرنس میں ترکی کے ایک پروفیسر الدکتور عبدالحمید براشق سے ملاقات ہوئی۔قطر یونی ورسٹی میں وہ تفسیر کے پروفیسر ہیں۔اس سے پہلے وہ پاکستان میں رہ چکے ہیں۔اِس لیے وہ اچھی اردو جانتے ہیں۔انھوں نے بتایا کہ ہمارے یہاں دہلی میں ہر اتوار کو جو لیکچر ہوتا ہے اور جس کو لائیو ٹیلی کاسٹ کیا جاتا ہے، اس کو وہ پابندی کے ساتھ انٹرنیٹ پر سنتے ہیں۔انھوں نے بتایا کہ ہماری یونی ورسٹی کی لائبریری میں آپ کی اردو کتابیں موجود ہیں۔

ہمارے ایک ساتھی مسٹر رجت مہلوترا نے کہا جب میں دعوت الی اللہ کا کام کرتا ہوں اور لوگوں سے مل کر انھیں دعوتی لٹریچر اور قرآن دیتا ہوں تو عجیب خوشی محسوس ہوتی ہے۔میں نے کہا کہ یہ فطری بات ہے۔دعوت کا کام خدا کا کام ہے۔اِس کام کو قرآن میں خدا کی نصرت کا کام بتایا گیا ہے۔اور خدا کی نصرت سے بڑا کون سا کام ہوسکتا ہے۔یہ احساس کہ میں خدا کے کام میں ہوں، بلاشبہہ اِس سے بڑی خوشی اور کسی چیز سے نہیں ہوسکتی۔

یہاں قطر میں ملاقات کے دوران ایک واقعہ معلوم ہوا۔ایک صاحب نے بتایا کہ ایک

ہندستانی عالم جو قطر میں رہتے ہیں، ان کی بیوی نے ان کے بارے میں اپنی ماں سے کہا کہ میں اُن کے نکاح میں ایک سال سے تھی، مگر انھوں نے کبھی خدا اور آخرت کی بات نہیں کی، اگر چہ وہ مدرسہ کے پڑھے ہوئے تھے۔ جب سے انھوں نے الرسالہ مشن کی کتابیں پڑھی ہیں، وہ مجھ سے صرف خدا اور آخرت کی بات کرتے ہیں، جب کہ اِس سے پہلے وہ دوسری دوسری باتیں کیا کرتے تھے۔

یہی عام طور پر لوگوں کا حال ہے۔ میرا تجربہ ہے کہ لوگوں نے اِس حقیقت کو نہیں جانا کہ عورت کا رول ان کی زندگی میں کیا ہے۔ لوگ عام طور پر عورت کے صرف کم تر رول کو جانتے ہیں، وہ عورت کے برتر رول کو دریافت نہ کرسکے۔ مثلاً ایک صاحب نے اپنی بیوی کی تعریف کی۔ میں نے پوچھا کہ آپ اپنی بیوی میں کیا خاص بات پاتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ وہ روزانہ مجھ کو اچھے اچھے کھانے پکا کر کھلاتی ہے۔ میں نے کہا کہ آپ نے عورت کو صرف کچن پارٹنر کی حیثیت سے جانا، مگر آپ عورت کو اپنے انٹلکچول پارٹنر کی حیثیت دریافت نہ کرسکے۔

20 اکتوبر 2009 کو ہوٹل کے ''سلویٰ ہال'' میں ایک سیشن کا موضوع یہ تھا:

القيم الروحية وتحقيق الوحدة والتضامن:

Achieving Unity and Solidarity Through Spiritual Values

اِس سیشن میں جن لوگوں نے تقریر کی، ان میں ایک صاحب وہ تھے جو یوکے (U.K.) سے آئے ہوئے تھے۔ اُن کا نام یہ تھا— ڈونالڈ (Rev.Donald Reeves)۔ انھوں نے اپنی تقریر کا آغاز ساؤتھ افریقہ کے مشہور لیڈر نیلسن منڈیلا (Nelson Mandela) کے اِس قول سے کیا:

If you want peace, then talk to your
enemies & not with your friends.

یعنی اگر تم امن چاہتے ہو تو اپنے دشمن سے بات کرو، نہ کہ اپنے دوستوں سے۔

میں نے ایک صاحب سے بات کرتے ہوئے کہا کہ یہ قول ایک غیر فطری قول ہے۔ اصل یہ ہے کہ ''دوست اور دشمن'' کی اصطلاح میں سوچنا چھوڑ دیا جائے۔ انسان کو صرف انسان سمجھا جائے۔

میں نے کہا کہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جس کو آپ اپنا دشمن سمجھ لیتے ہیں، وہی عملی اعتبار سے آپ کا سب سے بڑا دوست ہوتا ہے۔

اِس معاملے کی ایک مثال خود نیلسن منڈیلا کا ملک ساؤتھ افریقہ ہے۔ ساؤتھ افریقہ کو ایک ترقی یافتہ ملک سمجھا جاتا ہے۔ ساؤتھ افریقہ کو کس نے ترقی یافتہ ملک بنایا۔ یہ نیلسن منڈیلا یا ان کے ساتھی نہیں تھے، بلکہ وہ باہر سے آئے ہوئے انگریز تھے جن کو نیلسن منڈیلا اور ان کے ساتھی دشمن بتا کر اُن کے خلاف ''آزادی'' کی لڑائی لڑتے رہے۔

ہمارے ساتھیوں نے مسٹر ڈونالڈ کو انگریزی ترجمہ کی ایک کاپی دی۔ اس کو دیکھ کر انھوں نے کہا:

It looks very beautiful. It can fit into my pocket very easily.

20 اکتوبر 2009 کو میری تقریر سننے کے بعد کانفرنس میں فرنچ زبان کی مترجم مزنفیسہ (Nefissa El Bakly) نے میرے ایک ساتھی سے گفتگو کرتے ہوئے کہا:

Maulana Wahiduddin Khan has a unique perspective of Islam.

اِس کانفرنس میں عربی، انگریزی اور فرنچ زبان رائج تھی۔ میں نے انگریزی میں تقریر کی۔ میں نے اپنی تقریر میں کہا کہ موجودہ زمانے میں ہر عورت اور مرد پیس (peace) کی بات کرتا ہے، مگر یہ لوگ پولٹکل فارمولے کے ذریعے پیس کو حاصل کرنا چاہتے ہیں، جب کہ پولٹکل فارمولا اِس معاملے میں قابل عمل نہیں۔ یہاں اسپریچول فارمولا درکار ہے۔ یہ اسپریچول فارمولا قرآن میں دیا گیا ہے، وہ **الصلح خیر** (النساء: 128) کا فارمولا ہے۔ اسپریچول فارمولے کا مطلب ہے — معاملے کو یک طرفہ بنیاد پر حل کرنا:

To solve the problem on unilateral basis

میں نے کہا کہ نزاع کے موقع پر اسپریچول فارمولا ہی قابل عمل فارمولا ہے، نہ کہ پولٹکل فارمولا۔

ایک عرب اسکالر سے ملاقات ہوئی۔ وہ یہودیوں کے بارے میں بہت سخت الفاظ بولنے لگے — وہ ظالم ہیں، وہ سازشی ہیں، وغیرہ۔ میں نے کہا کہ موجودہ زمانے کے مسلمان، عرب اور غیر عرب دونوں، یہود کے بارے میں اِسی قسم کے منفی خیالات رکھتے ہیں، مگر آپ جیسے لوگ یہود کے

بارے میں صرف اتنا ہی جانتے ہیں کہ 1948 میں وہ فلسطین میں داخل ہوگئے اور یہاں کے ایک حصے پر اسرائیلی حکومت قائم کرلی، وغیرہ۔

مگر یہ ایک ناقص رائے ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہود نے بہت بڑے بڑے علمی کارنامے انجام دئے ہیں، قدیم مسلم اسپین میں بھی اور اِسی طرح موجودہ دور میں بھی۔ اِس وقت میں دورِ جدید کی نسبت سے ان کے صرف ایک کارنامے کا حوالہ دوں گا۔ یہ ایک ایسا کارنامہ ہے جس کے برابر کارنامہ موجودہ زمانے میں کوئی مسلم عالم بھی انجام نہ دے سکا۔

یہ کام پہلی بار ایک یہودی سائنس داں نے کیا، یعنی آئن اسٹائن (Albert Eienstein) نے۔ آئن اسٹائن نے خالص سائنسی بنیاد پر یہ ثابت کیا کہ موجودہ دنیا میں انسان کسی بھی شعبے میں صرف اضافی علم (relative knowledge) تک پہنچ سکتا ہے، حقیقی علم (real knowledge) تک پہنچنا انسان کے لیے ممکن ہی نہیں۔ ایسی حالت میں انسان کے لیے صرف دو میں سے ایک کا آپشن ممکن ہے — ایک، یہ کہ وہ ہمیشہ تشکیک (scepticism) میں مبتلا رہے۔ دوسرا آپشن یہ ہے کہ وہ علمی امکان (probability) پر اپنے یقین کی بنیاد رکھے۔ چوں کہ اِس دنیا میں تشکیک کوئی قابلِ عمل نظریہ نہیں، اس لیے انسان مجبور ہے کہ وہ علمی امکان کو اپنے یقینی علم کی بنیاد بنائے۔ قرآن کے مطابق، یہی کسی انسان کا ٹسٹ پر پورا اترنا ہے۔ میری بات سن کر مذکورہ عرب اسکالر نے کہا کہ میں نے اِس اعتبار سے کبھی نہیں سوچا تھا، اب میں اِس پر غور کروں گا۔

قرآن میں مومن کی ایک صفت سیاحت (سفر) بتائی گئی ہے (التوبة: 112)۔ مگر موجودہ زمانے میں عام طور پر سفر تفریحی سفر کے ہم معنی بن گیا ہے، جب کہ قرآنی سیاحت کا مطلب معرفت کی سیاحت ہے۔ مگر موجودہ زمانے کے مسلمان معرفت کے سفر سے تقریباً نا آشنا ہوچکے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ حج اور عمرہ کا سفر آج کل صرف آؤٹنگ (outing) کے ہم معنیٰ بن گیا ہے۔ مسلم جرائد میں اکثر مسلمانوں کے سفرنامے چھپتے رہتے ہیں، لیکن وہ جدید اصطلاح میں ٹورازم (tourism) کے ہم معنیٰ ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر حال میں ایک معروف عالم کا سفرنامہ ایک ماہ نامہ میں نظر سے گزرا۔ یہ سفر

ارضِ اُردن (عمّان) کے لیے تھا۔ اِس سفرنامے کا آغاز کچھ اِس طرح تھا:

''یہ ایک چمکیلی شام تھی۔ میری بیٹی کے یہاں سب جمع تھے۔ میرے ایک عزیز ابھی ابھی اردن میں بحرِ میت کے کنارے ایک کانفرنس میں شرکت کے بعد واپس لوٹے تھے۔ ان کا بیگ یادگاری تحائف بانٹنے کا منتظر تھا۔ بیگ کھلتا چلا گیا اور آخر میں پانی سے بھری ہوئی ایک بوتل نکلی۔ میرے عزیز نے کہا: اب کچھ تماشا ہو جائے—— بچوں سمیت ہر شخص بحرِ میت کے اِس پانی کو چکھے گا اور اگر وہ اس کا ذائقہ سہار نہ سکا تو گلاس حاضر ہے، وہ اس میں تھوک دے۔ سب سے پہلے بچوں کی باری تھی۔ ایک کے بعد دوسرا اس پانی کا ایک ایک گھونٹ چکھتا گیا اور منہ بنا کر اسے اگلتا رہا۔ میرے بھائیوں میں سے ایک بھائی بھی مع اپنی اہلیہ کے حاضر تھے۔ وہ دونوں بھی اس تجربے سے محظوظ ہوئے۔ آخر میں گھر کے سب سے بزرگ فرد یعنی راقم کی باری تھی۔ میں نے تمغۂ شجاعت کا اعزاز حاصل کرنے کے لیے پانی کے دو گھونٹ غٹا غٹ چڑھا لیے۔ بحرِ مردار کے پانی میں نمک کی مقدار اتنی زیادہ ہے کہ اس کا پینا آفتِ جان ہوسکتا ہے۔ جوں ہی یہ پانی معدہ سے ٹکرایا تو پیٹ میں ایک بھونچال برپا ہوگیا۔ اب ایسا معلوم ہوا کہ شعلے بھڑک اٹھے ہیں۔ اپنی بہت سی نادانیوں میں ایک اور کا اضافہ ہوگیا''۔

اول یہ کہ یہ زبان مومنِ سائح کی زبان نہیں ہے۔ مومنِ سائح کے کلام میں جو سنجیدگی ہونی چاہیے، وہ اِس عبارت میں مفقود ہے۔ دوسری بات یہ کہ مومن کی سیاحت عبرت اور نصیحت کے لیے ہوتی ہے، نہ کہ ''تماشا'' کے لیے۔ مذکورہ عبارت میں جس پانی کا ذکر ہے، وہ بحرِ مردار (Dead Sea) کا پانی تھا۔ بحرِ مردار اُس خدائی عذاب کے باقیات میں سے ہے جو قومِ لوط پر آیا تھا۔ قرآن میں بتایا گیا ہے کہ اِن آثار میں اہلِ ایمان کے لیے نشانیاں ہیں (**الحجر**: 77-75)۔ لیکن موجودہ زمانے کے مسلمان وہاں سے گزرتے ہیں اور وہاں انھیں تفریح اور تماشے کے سوا کچھ اور نظر نہیں آتا۔

موجودہ زمانے میں مسلمانوں کے گھر کا جو ماحول ہوتا ہے، اس کی ایک تصویر مذکورہ اقتباس میں نظر آتی ہے۔ اِس اقتباس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے گھروں کا ماحول بے حسی کا ماحول بن گیا ہے۔ یہی وہ ماحول ہے جو موجودہ زمانے میں بچوں کو بگاڑ رہا ہے۔

مسلمان اپنے بچوں کے بگاڑ کے لیے خارجی چیزوں کی شکایت کرتے ہیں، حالاں کہ یہ دراصل اُن کا اپنا گھر ہے جو اُن کے بچوں کے بگاڑ کا اصل ذریعہ ہے۔ بچوں کی اصلاح کے سلسلے میں سب سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ بچوں کے اندر آخرت کا احساس پیدا ہو جائے، جب کہ مذکورہ قسم کے گھر میں بچوں کے اندر احساسِ دنیا پیدا ہوتا ہے، نہ کہ احساسِ آخرت۔ جو لوگ آخرت میں خدا کی رحمت سے محروم قرار پائیں گے، ان کے گھروں کی تصویر قرآن میں اِس طرح بتائی گئی ہے کہ وہ اپنے گھروں میں خوش وخرم (الإنشقاق: 13) رہتے تھے— بچوں کی اصلاح کا تعلق خارجی ''وعظ'' سے نہیں ہے، بلکہ وہ تمام تر گھر کے داخلی ماحول پر منحصر ہے۔

میرے ساتھی اِس سفر میں رات دن صرف ایک کام کے لیے دوڑ رہے تھے، اور وہ ہے— قرآن کا انگریزی ترجمہ اور اسلامی لٹریچر لوگوں تک پہنچانا۔ اِسی کا نام مشنری اسپرٹ ہے۔ مشنری اسپرٹ دراصل اِس احساس سے پیدا ہوتی ہے کہ آپ کے پاس دوسروں کو دینے کے لیے کوئی چیز ہے۔ شاید اِس سے بڑی کوئی قوتِ محرکہ (incentive force) نہیں۔ یہ سادہ بات نہیں، اِس کا مطلب یہ ہے کہ یہی وہ لوگ ہیں جو حدیث کے مطابق، ''ادخال کلمہ'' کا کام انجام دے رہے ہیں۔

قطر کی اِس کانفرنس میں ہر ملک کے مسلم علماء آئے ہوئے تھے۔ اِس کے علاوہ، ہر مذہب کے نمائندے بھی یہاں موجود تھے۔ مگر کسی بھی ملک کے مسلمان نے یہ نہیں کیا کہ وہ قرآن کا ترجمہ یا اسلامی لٹریچر حاضرین کو مطالعے کے لیے دے۔ یہ صرف سی پی ایس کے لوگ تھے جو دوڑ دوڑ کر لوگوں کو قرآن کا انگریزی ترجمہ اور اسلامی لٹریچر دے رہے تھے۔ تمام لوگ اس کو بڑے شوق سے لے رہے تھے اور مزید نسخوں کا مطالبہ کرتے تھے، تاکہ وہ اسے دوسروں کو دے سکیں۔

ہمارے ساتھی ایک صاحب سے ملے۔ وہ مراکو سے آئے ہوئے تھے۔ وہ کئی ملکوں میں مراکو کے سفیر رہ چکے ہیں۔ اُن کو قرآن کے انگریزی ترجمہ کی ایک کاپی دی گئی۔ انھوں نے تین اور کاپی مانگی۔ انھوں نے کہا کہ اِس کو میں شاہی محل میں پہنچاؤں گا۔ اِسی طرح ہر ایک نے نہایت شوق کے ساتھ قرآن کا انگریزی ترجمہ لیا، جیسے وہ پہلے سے اس کے منتظر تھے۔

قدرتی گیس کی دریافت سے پہلے قطر ایک غریب ملک تھا۔ اب وہ یورپ اور امریکا کی مانند ایک ترقی یافتہ ملک بن چکا ہے۔ اِس کا تقاضا تھا کہ لوگوں کے دلوں میں شکر کا دریا موج زن ہو جائے، لیکن مجھے اپنے زمانۂ قیام میں کوئی ایسا شخص نہیں ملا جو حقیقی معنوں میں شکرِ خداوندی کی بات کرتا ہو۔

ایسا کیوں ہوتا ہے کہ انسان اسبابِ شکر کے درمیان ناشکرا بنا رہتا ہے۔ اس کا جواب ایک حدیث رسول میں ملتا ہے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **ينزل بالعبد الأمر فيدعوا الله عزّ وجل، فيصرفه عنه، فيأتيه الشيطانُ فيضعّف شكره (الشكر لابن أبي الدنيا، رقم الحديث: 25)** یعنی جب اللہ کسی انسان کو اپنی نعمت عطا فرماتا ہے تو شیطان اس کے پاس آتا ہے اور وہ شکر کے احساس کو کم زور کردیتا ہے۔ یہ ''تضعیف'' یعنی شکر کے اروژن (erosion) کا عمل کس طرح ہوتا ہے۔ وہ اِس طرح ہوتا ہے کہ شیطان شعوری یا غیر شعوری طور پر انسان کے ذہن میں یہ ڈال دیتا ہے کہ یہ نعمت تم کو خدا کی طرف سے نہیں ملی، بلکہ وہ فلاں سبب سے تم کو ملی ہے۔ مثلاً کسی اتفاق سے، اپنی کسی قابلیت سے، خاندانی وراثت سے، وغیرہ۔ مثال کے طور پر جب عرب کی سرزمین کے نیچے تیل کے ذخائر برآمد ہوئے تو مغربی ''ماہرین'' نے کہا یہ جغرافی حادثہ (accident of geography) کا نتیجہ ہے، وغیرہ۔ یہی وہ باتیں ہیں جن کو حدیث میں شیطانی تضعیف کہا گیا ہے۔

20 اکتوبر 2009 کو دکتور عبدالمجید عمر النجّار سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے بتایا کہ وہ راقم الحروف کی کتاب ''**الاسلام يتحدى**'' پڑھ چکے ہیں۔ انھوں نے اپنی کتاب ''**الإيمان بالله وأثره في الحياة**'' (صفحات: 225) دار الغرب الاسلامی، بیروت 1997) میں ''**الإسلام يتحدى**'' کو مصادر میں سے شمار کیا ہے۔ دکتور عمر النجّار کی ایک شاگرد مزآمال حمیدی کے ذریعے مجھ کو یہ کتاب ملی۔ دکتور عمر النجّار پیرس (فرانس) میں اسلامک اسٹڈیز اینڈ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر ہیں۔

دکتور النجار کی یہ کتاب قدیم علمِ کلام اور جدید علمِ کلام کی روشنی میں لکھی گئی ہے۔ قدیم علمِ کلام یونانیات کے ردعمل میں پیدا ہوا تھا۔ اِسی طرح مصنف نے لکھا ہے کہ دورِ جدید میں بعث وتجدید کی ایک نئی تحریک شروع ہوئی۔ اس کا محرک غالباً اسلامی عقیدے کے خلاف وہ شدید چیلنج تھا جو مغربی

استعمار کے دور میں ظاہر ہوا جس نے امت اسلامیہ کو اپنا نشانہ بنایا تھا (منذ حل يقارب القرن من الزّمن بدأت تدبّ فی علم العقيدة حركة بعث و تجديد. ربّما كان الدارع إليها شدّة التحدّی للعقيدة الإسلامية من قِبل الغرب۔ صفحہ 23)۔

قدیم علمِ کلام بلاشبہہ یونانیات کے ردعمل میں پیدا ہوا تھا، لیکن جدید علمِ کلام کی نوعیت اس سے مختلف ہے۔ جدید علمِ کلام کی ضرورت اصلاً کسی ''استعماری حملہ'' کے نتیجے میں نہیں پیدا ہوئی، بلکہ وہ خود علم کے نئے ارتقاء کے نتیجے میں پیدا ہوئی۔ جدید سائنسی علم اپنی حقیقت کے اعتبار سے اسلامی عقیدے پر کوئی حملہ نہیں ہے، بلکہ وہ اسلامی عقیدے کے لیے علمی تائید کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ ایک مثبت ظاہرہ ہے، نہ کہ منفی ظاہرہ۔ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ جدید سائنس موجودہ زمانے میں اسلام کا علمِ کلام ہے۔ عباسی دور کا علمِ کلام ایک دفاعی علم کے طور پر پیدا ہوا تھا، لیکن دورِ جدید کے علمِ کلام کی حیثیت اِس سے مختلف ہے۔ دورِ جدید میں علمِ کلام کا مطلب ہے — جدید علمی مسلّمات کی روشنی میں اسلامی عقیدے کا ازسرِ نو اظہار۔

22 اکتوبر 2009 کی شام کو مولانا محمد شاہد خان ندوی اپنی اہلیہ کے ساتھ ہوٹل میں ملاقات کے لیے آئے۔ میں نے ان لوگوں سے کہا کہ آپ ہماری چھ کتابیں ضرور پڑھیے — خاتونِ اسلام، عورت معمارِ انسانیت، رازِ حیات، تعمیرِ حیات، رہنمائے حیات، کتابِ زندگی۔ اس کے بعد میں نے دونوں سے کہا کہ عورت صرف گھر کی رفیقہ نہیں ہے، بلکہ عورت اور مرد دونوں ایک دوسرے کے لیے بہترین انٹلکچول پارٹنر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ آپ دونوں شعوری طور پر اِس کے لیے اپنے آپ کو تیار کریں۔ دونوں بہت دیر تک ہوٹل میں ہمارے پاس رہے۔ ان سے دعوت الی اللہ کے موضوع پر بھی بات ہوئی۔

22 اکتوبر 2009 کی شام کو قطر سے دہلی کے لیے واپسی ہوئی۔ ہوٹل سے روانہ ہو کر ہم لوگ قطر ائر پورٹ پہنچے۔ یہاں انتظار کے طور پر کچھ دیر ائر پورٹ کے لاؤنج میں ہمارا قیام تھا۔ یہ لاؤنج محل کے انداز میں بنایا گیا ہے۔ دیگر سہولیات کے علاوہ، یہاں کھانے پینے کا بھی اعلیٰ انتظام تھا۔

لیکن اس کی ایک چیز میرے لیے پریشان کن تھی۔ یہ لاؤنج مکمل طور پر ائرکنڈیشنڈ تھا۔ ائرکنڈیشننگ میرے ذوق کے مطابق نہیں۔ لاؤنج کے باہر لان میں بیٹھنا ممکن تھا، لیکن انتظار کی مجبوری کی بنا پر ہمیں اسی لاؤنج کے اندر ٹھیرنا پڑا۔

ائرپورٹ کے لاؤنج میں ایک خاص شخص سے ملاقات ہوئی۔ یہ حسن ادریسی الحمادی تھے۔ وہ ابوظبی (امارات) میں منسٹر آف پریسیڈنشیل ایگزیکٹیو سکریٹری ہیں۔ میرے ساتھیوں نے ان کو قرآن کا انگریزی ترجمہ دیا۔ وہ بہت خوش ہوئے۔ لاؤنج میں مزید کئی ٹاپ کے لوگوں سے ملاقات ہوئی۔ ہمارے ساتھیوں نے سب کو قرآن کا انگریزی ترجمہ اور اسلامی لٹریچر دیا۔

دورانِ پرواز قطر ائر لائنز کے میگزین بازار (Harper's) کا شمارہ اکتوبر 2009 دیکھا۔ 300 صفحے کے اِس میگزین میں تقریباً تمام آئٹم فیشن سے تعلق رکھتے تھے۔ میگزین کے صفحہ 250 پر ایک لگزری رزورٹ (The Body Holiday) کا اشتہار اِن الفاظ میں چھپا تھا:

Give us your body for a week, And
we will give you back your mind.

اِس عنوان کے تحت ساحل پر تفریحی پروگرام کی تفصیل تھی۔ اس کے آخر میں یہ الفاظ درج تھے:

You are guaranteed a remarkable experience
in the persuit of health and well being.

یہ ایک مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اِس زمانے میں دماغ (mind) کو بھی جسم (body) کے ماتحت بنا دیا گیا ہے۔ جدید کلچر میں یہ ذہن بنا دیا جاتا ہے کہ وہ جسم ہی کو سب کچھ سمجھے۔ چناں چہ اِس زمانے میں پرسنالٹی ڈیولپ مینٹ (personality development) کا مطلب ہوتا ہے: فزیکل ڈیولپ مینٹ یا باڈی ڈیولپ مینٹ (physical development or body development)، ذہنی یا روحانی ارتقا (spiritual development) کا تصور جدید کلچر میں موجود نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جدید انسان اِس ارشادِ خداوندی کا کامل مصداق بنا ہوا ہے: **یتمتّعون ویأکلون کما تأکل الأنعام (محمد: 12)**

23 اکتوبر 2009 کی صبح کو تین بجے ہمارے جہاز نے دہلی ائر پورٹ پر لینڈنگ کی۔ یہ تین گھنٹے کی ایک اسموتھ فلائٹ (smooth flight) تھی۔ ائر پورٹ کی ضروری کارروائیوں سے فارغ ہو کر ہم لوگ باہر آئے۔ ائر پورٹ کے باہر ہمارے ڈرائیور پیشگی طور پر موجود تھے۔ پہلے زمانے میں ائر پورٹ پر اترنے کے بعد ڈرائیور کو پانا ایک مشکل کام ہوتا تھا، لیکن اب موبائل کی ایجاد نے اِس مسئلے کو بالکل آسان بنا دیا ہے۔ ائر پورٹ کے باہر ہمارے ڈرائیور پیشگی طور پر موجود تھے۔ ائر پورٹ پر اتر کر آپ اپنے ڈرائیور کو بتا دیجئے اور باہر نکلتے ہی آپ اس کو گیٹ پر موجود پائیں گے۔ یہ سہولت بھی اُن بے شمار انعاماتِ الٰہیہ میں سے ہے جس کو قرآن میں اِن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: **وآتاکم من کل ماسألتموہ** (إبراهيم: 34)۔

ائر پورٹ سے روانہ ہو کر بذریعہ کار ہم لوگ نظام الدین (ویسٹ) پہنچ گئے۔ دہلی سے قطر کا یہ سفر میرے لیے ایک خواب کی مانند تھا، ایک ایسا خواب جو دہلی سے شروع ہوا اور پھر دہلی پر ختم ہو گیا۔ سفر کے دوران جو کچھ پیش آیا، وہ گویا کہ کسی پراسرار خارجی طاقت کے ذریعے پیش آیا۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اِس پورے سفر میں میری حیثیت صرف ایک معمول کی تھی، نہ کہ عامل کی۔

(یہ سفر نامہ مولانا محمد ذکوان ندوی کے تعاون سے تیار کیا گیا)۔

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر، مولانا وحید الدین خاں کے قلم سے

اللہ اکبر
اتحادِ ملّت
احیاءِ اسلام
اسباقِ تاریخ
اسفارِ ہند
اسلام: ایک تعارف
اسلام: ایک عظیم جدوجہد
اسلام اور عصرِ حاضر
اسلام پندرہویں صدی میں
اسلام دورِ جدید کا خالق
اسلام دینِ فطرت
اسلام کا تعارف
اسلام کیا ہے
اسلامی تعلیمات
اسلامی دعوت
اسلامی زندگی
اقوالِ حکمت
الاسلام
الربانیۃ
*امنِ عالم
امہات المومنین
انسان اپنے آپ کو پہچان
*انسان کی منزل
ایمانی طاقت
آخری سفر
باغِ جنت
پیغمبرِ اسلام
پیغمبرِ انقلاب
تذکیر القرآن (مکمل)
تاریخِ دعوتِ حق
تاریخ کا سبق
تبلیغی تحریک
تجدیدِ دین
تصویرِ ملت
تعارفِ اسلام
تعبیر کی غلطی
تعددِ ازواج
تعمیرِ انسانیت

تعمیرِ حیات
تعمیر کی طرف
تعمیرِ ملت
حدیثِ رسول
حقیقتِ حج
حقیقت کی تلاش
حل یہاں ہے
حیاتِ طیبہ
خاتونِ اسلام
خدا اور انسان
خلیج ڈائری
دعوتِ اسلام
دعوتِ حق
دینِ انسانیت
دینِ کامل
دین کی سیاسی تعبیر
دین کیا ہے
*دین و شریعت
دینی تعلیم
ڈائری 84-1983
ڈائری 90-1989
ڈائری 92-1991
*ڈائری 94-1993
رازِ حیات
راہِ عمل
راہیں بند نہیں
روشن مستقبل
رہنمائے حیات (کتابچہ)
*رہنمائے حیات
زلزلۂ قیامت
سبق آموز واقعات
سچا راستہ
سفرنامہ اسپین و فلسطین
سفرنامہ (غیر ملکی اسفار، جلد اول)
سفرنامہ (غیر ملکی اسفار، جلد دوم)
سوشلزم اور اسلام
سوشلزم ایک غیر اسلامی نظریہ
*سیرتِ رسول

شتمِ رسول کا مسئلہ
صراطِ مستقیم
صومِ رمضان
طلاق اسلام میں
ظہورِ اسلام
عظمتِ اسلام
عظمتِ صحابہ
عظمتِ قرآن
عظمتِ مومن
عقلیاتِ اسلام
علما اور دورِ جدید
*عورت معمارِ انسانیت
فسادات کا مسئلہ
فکرِ اسلامی
قال اللہ و قال الرسول
قرآن کا مطلوب انسان
قیادت نامہ
کاروانِ ملت
کتابِ زندگی
مارکسزم: تاریخ جس کو رد کر چکی ہے
مذہب اور جدید چیلنج
مذہب اور سائنس
*مسائلِ اجتہاد
مضامینِ اسلام
*مطالعۂ حدیث
*مطالعۂ سیرت (کتابچہ)
*مطالعۂ سیرت
*مطالعۂ قرآن
منزل کی طرف
*مولانا مودودی شخصیت اور تحریک
میوات کا سفر
نارِ جہنم
نثری تقریریں
ہندستان آزادی کے بعد
ہندستانی مسلمان
*ہند-پاک ڈائری
یکساں سول کوڈ

* نئی کتابیں

ایجنسی الرسالہ

الرسالہ بیک وقت اردو اور انگریزی میں شائع ہوتا ہے۔ الرسالہ (اردو) کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ الرسالہ (انگریزی) کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہنچایا جائے۔ الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہنچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہنچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملّت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کارِ نبوت ہے اور ملت کے اوپر سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

1- الرسالہ کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے کمیشن 25 فی صد ہے۔ 100 پرچوں سے زیادہ تعداد پر کمیشن 33 فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمہ ہوتے ہیں۔

2- زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کئے جاتے ہیں۔

3- کم تعداد والی ایجنسی کے لئے ادائیگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں، اور صاحبِ ایجنسی ہر ماہ یا دو تین ماہ بعد اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کردے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینے میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

زر تعاون الرسالہ

	ہندستان کے لئے	بیرونی ممالک کے لئے (ہوائی ڈاک)
ایک سال	Rs. 100	$20
دو سال	Rs. 200	$40
تین سال	Rs. 300	$60